عظمتِ قرآن

مولانا وحید الدّین خاں

Azmat-e-Quran
By Maulana Wahiduddin Khan

First published 1986

Reprinted 2024

This book is copyright free and royalty free. It can be translated, reprinted, stored or used on any digital platform without prior permission from the author or the publisher. It can be used for commercial or non-profit purposes. However, kindly inform us about your publication and send us a sample copy of the printed material or link of the digital work.

CPS International
1 Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
info@cpsglobal.org

Goodword Books
A-21, Sector 4, Noida-201301
Delhi NCR, India
www.goodwordbooks.com
e-mail: info@goodwordbooks.com

Printed in India

فہرست

دیباچہ	5	نیوٹن کا نظریہ نور	42
قرآن خدا کی کتاب	8	کائنات کا آغاز	43
خدائی خاصہ	9	قرآن خدا کی آواز	55
نظریۂ ارتقاء	10	حفاظتِ قرآن	97
انسان کی لاعلمی	12	کتابِ محفوظ	115
علم سیاست	13	منصوبۂ خداوندی	129
تضاد کی دو قسمیں	18	دورِ جدید میں احیاءِ اسلام	142
داخلی تضاد	18	کائنات کی گواہی	154
حضرت مسیح کی شخصیت	19	اسلام کا اخلاقی تصور	158
کارل مارکس کا فکری تضاد	21	کائنات کی سطح پر	159
غیر متعلق مثال	23	اخلاق خداوندی	159
خارجی نامطابقت	25	اتحاد و تنظیم	161
قانونِ فطرت کی مثال	26	دخل اندازی نہیں	162
کتب مقدسہ کی مثال	30	تسلیم واعتراف	163
فرعون موسیٰ	35	نرم گفتاری	164
علم الحیات کی مثال	38	عفو درگزر	165

برائی کے بدلے بھلائی 166
خلاصہ 168
فکری انقلاب 170
دورِ جدید میں قرآنی دعوت 177
عالمی فضا کی تبدیلی 178
داعی اور مدعو کا تعلق 180
لٹریچر کی تیاری 183
موافق امکانات 188
افراد کار کی فراہمی 195
دعوتی مرکز کا قیام 200
ابدی صداقت 204

دیباچہ

اس مجموعہ میں قرآن کے تین مختلف پہلوؤں پر مختصر گفتگو کی گئی ہے۔ایک یہ کہ قرآن اپنی ذات میں اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا کی کتاب ہے۔دوسرا یہ کہ وہ اسی ابتدائی صورت میں کامل طور پر محفوظ ہے جیسا کہ وہ ساتویں صدی عیسوی میں پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا تھا، تیسرا یہ کہ قرآن ایک کتاب دعوت ہے۔اور اس کی دعوت میں اتنی قوت ہے کہ جب بھی اس کو صحیح طور پر دنیا کے سامنے لایا جائے گا وہ اقوام عالم کو مسخر کرلے گا۔

قرآن سے پہلے بھی خدا کی طرف سے بہت سی آسمانی کتابیں اتری تھیں۔پھر اس میں اور دوسری آسمانی کتابوں میں کیا فرق ہے۔

قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں میں جو فرق ہے وہ اس اعتبار سے نہیں ہے کہ ایک کامل ہے اور دوسری غیر کامل، ایک افضل ہے اور دوسری غیر افضل۔مختلف آسمانی کتابوں میں اس قسم کا امتیاز قائم کرنا خود پیغمبروں کے درمیان امتیاز قائم کرنا ہے۔اور خدا کے پیغمبروں کے درمیان امتیاز قائم کرنا یقینی طور پر صحیح نہیں۔

پھر دونوں کتابوں میں کیا فرق ہے۔وہ فرق صرف ایک ہے۔اور وہ یہ کہ قرآن محفوظ ہے۔جب کہ دوسری کتابیں اپنی اصلی اور ابتدائی حالت میں محفوظ نہیں۔یہی محفوظیت قرآن کی اصل امتیازی خصوصیت ہے۔اسی خصوصیت کی بنا پر اب وہ قیامت تک کے لیے واحد قابل اتباع اور واحد ذریعہ نجات کتاب ہے۔

تاہم قرآن کا محفوظ ہونا اور محفوظ رہنا کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ یہ اس آسمان کے نیچے پیش آنے والے تمام واقعات میں سب سے زیادہ عجیب ہے۔ اس کی غیر معمولی اہمیت اس وقت سمجھ میں آتی ہے جب کہ اس پر غور کیا جائے کہ دوسری کتابیں کیوں محفوظ نہیں رہیں۔ اور قرآن کیوں مکمل طور پر محفوظ حالت میں باقی ہے۔

خدا کو اگرچہ تمام موجودات پر کلی اختیار حاصل ہے۔ مگر متعین مدّت کے لیے اس نے انسانوں کو بربنائے امتحان آزادی دے دی ہے۔ اسی آزادی سے فائدہ اٹھا کر ہر بار انسان یہ کرتا رہا کہ آسمانی کتابوں کو بدلتا یا ضائع کرتا رہا۔ آخر کار خدا نے انسانوں کے اوپر اپنا خصوصی فضل فرمایا۔ اپنی ہدایت کو مسلسل صحیح حالت میں باقی رکھنے کے لیے اس نے مزید حفاظتی اہتمام کیا۔ خدا کی خصوصی مدد سے رسول اور اصحاب رسول ایک نئی تاریخ کو ظہور میں لائے۔ انہوں نے تمام شریروں کو زیر کیا۔ انھوں نے قدیم دنیا کو بدل کر ایک ایسی نئی دنیا پیدا کی جو اپنے ناقابل تسخیر موافق پہلوؤں کے ساتھ قرآن کی ابدی حفاظت کی ضامن بن جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن ظاہری اور معنوی دونوں اعتبار سے ہمیشہ کے لیے محفوظ اور غالب صحیفہ بن گیا۔

پہلا حصہ

دلائل قرآن

ذٰلِكَ الْكِتابُ لا رَيْبَ فِيهِ هُدىً لِلْمُتَّقِينَ(2:2)

یہ خدا کی کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔

یہ ہدایت ہے ڈرنے والوں کے لیے۔

قرآن خدا کی کتاب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ دعویٰ کیا کہ قرآن ایک آسمانی کتاب ہے جو خدا کی طرف سے انسانوں کی رہنمائی کے لیے اتری ہے تو بہت سے لوگوں نے اس کو نہیں مانا۔ انہوں نے کہا کہ یہ ایک انسانی تصنیف ہے، نہ کہ خدائی تصنیف۔ اس کے جواب میں قرآن میں کہا گیا کہ اگر تم اپنے قول میں سچے ہو تو قرآن کے مانند ایک کلام بنا کر لاؤ:

اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ تَقَوَّلَهٗ‌ ۚ بَلۡ لَّا يُؤۡمِنُوۡنَ فَلۡيَاۡتُوۡا بِحَدِيۡثٍ مِّثۡلِهٖۤ اِنۡ كَانُوۡا صٰدِقِيۡنَ (52:33-34)

اسی کے ساتھ قرآن نے مطلق لفظوں میں یہ اعلان کر دیا کہ اگر تمام انسان اور جن اس بات پر اکٹھا ہو جائیں کہ وہ قرآن جیسی کتاب لے آئیں تو وہ ہرگز نہ لا سکیں گے، چاہے وہ سب ایک دوسرے کے لیے مددگار ہو جائیں:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (17:88)

قرآن ایک ابدی کتاب ہے، اس لحاظ سے یہ ایک ابدی چیلنج ہے۔ قیامت تک کے تمام انسان اس کے مخاطب ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ قرآن کی وہ کون سی خصوصیت ہے جو انسان کے لیے ناقابل تقلید ہے، اس کے مختلف پہلو ہیں۔ یہاں ہم اس کے صرف ایک پہلو کا ذکر کریں گے جو قرآن میں ان لفظوں میں بیان ہوا ہے:

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا

كَثِيرًا(4:82)۔ کیا لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے۔ اور اگر وہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس کے اندر بڑا اختلاف پاتے۔

اس آیت میں "اختلاف" کی تفسیر تفاوت، تعارض، تناقض، تضاد وغیرہ الفاظ سے کی گئی ہے۔ آرتھر آربری(Arthur John Arberry, 1905-1969) نے اختلاف کا ترجمہ نامطابقت(inconsistency) کیا ہے۔

کلام میں تناقص نہ ہونا ایک انتہائی نادر صفت ہے جو صرف خدائے ذوالجلال کے یہاں پائی جاسکتی ہے۔ کسی انسان کے لیے ایسا کلام تخلیق کرنا ممکن نہیں۔ تناقض سے پاک کلام وجود میں لانے کے لیے ضروری ہے کہ صاحب کلام کا علم ماضی سے مستقبل تک کے امور کا احاطہ کیے ہوئے ہو۔ وہ تمام موجودات کا کلّی علم رکھتا ہو۔ وہ چیزوں کی اصل ماہیت سے بلااشتباہ پوری طرح باخبر ہو۔ اس کا علم براہ راست واقفیت پر مبنی ہو، نہ کہ بالواسطہ معلومات پر۔ اسی کے ساتھ اس کے اندر یہ انوکھی خصوصیت ہو کہ وہ اشیاء کو غیر متاثر ذہن سے ٹھیک ویسا ہی دیکھ سکتا ہو جیسا کہ وہ فی الواقع ہیں۔

یہ تمام غیر معمولی اوصاف صرف خدا میں ہو سکتے ہیں۔ کوئی انسان کبھی ان اوصاف کا حامل نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کا کلام ہمیشہ تضاد اور تناقض سے پاک ہوتا ہے۔ انسان کبھی ان اوصاف کا حامل نہیں ہوتا اس لیے انسان کا کلام کبھی تضاد اور تناقض سے پاک نہیں ہوتا۔

خدائی خاصہ

کلام میں تضاد کا معاملہ کوئی اتفاقی معاملہ نہیں، یہ انسانی فکر کا لازمی خاصہ ہے۔ یہ دنیا

اس طرح بنی ہے کہ وہ صرف خدائی فکر کو قبول کرتی ہے۔اس دنیامیں یہ ناممکن ہے کہ خدا کو چھوڑ کر کوئی متوافق نظریہ بنایا جاسکے۔خدا کے سوا دوسری بنیاد پر جو نظریہ بھی بنایا جائے گا،وہ فوراً تضاد کا شکار ہو جائے گا۔وہ کائنات کے مجموعی ڈھانچہ سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا۔اس دنیا میں کسی انسانی نظریہ کے لیے ممکن نہیں کہ وہ فکری تضاد سے خالی ہو سکے۔اس بات کو ہم یہاں مثال کے ذریعہ واضح کریں گے۔

نظریۂ ارتقاء

اس کی ایک مثال حیاتیاتی ارتقاء کا نظریہ ہے۔ڈارون (1809-1882) اور دوسرے سائنسدانوں نے دیکھا کہ زمین پر جو مختلف انواع حیات موجود ہیں ان میں ظاہری اختلافات کے باوجود حیاتیاتی نظام کے اعتبار سے کافی مشابہت پائی جاتی ہے۔ مثلاً گھوڑے کا ڈھانچہ اگر کھڑا کیا جائے تو وہ انسان کے ڈھانچے سے ملتا جلتا نظر آئے گا۔

اس قسم کے مختلف مشاہدات سے انہوں نے یہ نظریہ قائم کر لیا کہ انسان کوئی علاحدہ نوع نہیں۔انسان اور حیوان دونوں ایک ہی مشترک نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ رینگنے والے جانور اور چوپائے اور بندر سب حیاتیات کے سفر ارتقاء کی پچھلی کڑیاں ہیں۔ اور انسان اس سفر ارتقاء کی اگلی کڑی ہے۔

یہ نظریہ ایک سو سال تک انسانی ذہن پر حکمران رہا۔ مگر بعد کو مزید مطالعہ نے بتایا کہ وہ کائنات کے مجموعی نظام سے ٹکرا رہا ہے۔وہ اس کے اندر درست نہیں بیٹھتا۔

مثال کے طور پر سائنسی طریقوں کے استعمال سے اب یہ معلوم ہو گیا ہے کہ زمین کی عمر کیا ہے۔ چنانچہ اندازہ کیا گیا ہے کہ تقریباً دو ہزار ملین سال پہلے زمین وجود میں

آئی۔ یہ مدّت ڈراون کے مفروضہ ارتقاء کو ظہور میں لانے کے لیے انتہائی حد تک ناکافی ہے۔ سائنس دانوں نے حساب لگا کر اندازہ کیا ہے کہ صرف ایک پروٹینی سالمہ کے مرکب کو ارتقائی طور پر وجود میں لانے کے لیے سنکھ مہاسنکھ ملین سال سے بھی زیادہ لمبی مدت درکار ہے۔ پھر صرف دو ہزار ملین سال میں زمین کی سطح پر مکمل اجسام رکھنے والے حیوانات کی دس لاکھ سے زیادہ قسمیں کیسے بن گئیں اور نباتات کی دو لاکھ سے زیادہ تکمیل یافتہ قسمیں کیوں کر وجود میں آ گئیں۔ اس قلیل مدت میں تو ایک معمولی حیوان بھی نہیں بن سکتا۔ کجا کہ مفروضہ ارتقاء کے مطابق لاتعداد مراحل سے گزر کر انسان جیسی اعلیٰ نوع ظہور میں آجائے۔

نظریہ ارتقاء حیاتیاتی عمل میں جن نوعی تبدیلیوں کو فرض کرتا ہے ان کے متعلق ریاضیات کے ایک عالم پاچو (Patau) نے حساب لگایا ہے۔ اس کے مطابق کسی نوع میں ایک چھوٹی سی تبدیلی کو مکمل ہونے کے لیے دس لاکھ پشتوں کی مدت درکار ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر مفروضہ ارتقائی عمل کے ذریعے کتے جیسی نسل میں ان گنت تبدیلیوں کے جمع ہونے سے گھوڑے جیسا بالکل مختلف جانور بنے تو اس کے بننے میں کس قدر زیادہ لمبا عرصہ درکار ہوگا۔

اس مشکل کو حل کرنے کے لیے وہ نظریہ وضع کیا گیا جس کو پینس پرمیا (Panspermia) کا نظریہ کہا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ زندگی ابتداءً زمین کے باہر بالائی خلا میں کسی مقام پر پیدا ہوئی اور وہاں سے سفر کر کے زمین پر آئی۔ مگر تحقیق نے بتایا کہ اس کو ماننے میں اور بھی زیادہ بڑی بڑی مشکلیں حائل ہیں۔ زمین کے علاوہ وسیع کائنات کے کسی بھی ستارہ یا سیارہ پر وہ اسباب موجود نہیں ہیں جہاں زندگی جیسی چیز نشو و نما

پاسکے۔ مثلاً پانی جو زندگی کے ظہور اور بقا کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے وہ اب تک کی معلومات کے مطابق زمین کے سوا کہیں اور موجود نہیں۔

پھر کچھ ذہین افراد نے فجائی ارتقاء (Emergent Evolution) کا نظریہ وضع کیا۔ اس کے مطابق فرض کیا گیا کہ زندگی یا اس کی انواع بالکل اچانک پیدا ہو جاتی ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ محض ایک لفظ ہے، نہ کہ کوئی علمی نظریہ۔ اچانک پیدائش کبھی اندھے مادی قوانین کے ذریعہ ممکن نہیں۔ اچانک پیدائش کا نظریہ لازمی طور پر ایک مداخلت کرنے والے کا تقاضا کرتا ہے۔ یعنی اس خارجی عامل کا جس کو نہ ماننے کے لیے یہ تمام نظریات گھڑے گئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی توجیہ ایک خالق کو مانے بغیر ممکن ہی نہیں۔ خالق کو چھوڑ کر دوسری جو بنیاد بھی تلاش کی جائے گی وہ کائنات کے نقشہ سے ٹکرا جائے گی، وہ اس کے ڈھانچے میں جگہ نہیں پاسکتی۔

انسان کی لاعلمی

لندن سے ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے ''قاموس جہالت''۔ اس قاموس کی ترتیب میں مختلف شعبوں کے ممتاز اہل علم نے حصہ لیا ہے۔ اس کے تعارف نامہ میں بتایا گیا ہے کہ قاموس جہالت میں ساٹھ نہایت معروف سائنس دانوں نے مختلف تحقیقی شعبوں کا جائزہ لے کر دکھایا ہے کہ دنیا کے متعلق ہمارے علم میں کون سے بامعنی خلا پائے جاتے ہیں:

> In the *Encyclopaedia of Ignorance* some 60 well-known scientists survey different fields of research, trying to point out significant gaps in our knowledge of the world.

یہ کتاب در حقیقت اس واقعہ کا علمی اعتراف ہے کہ دنیا کو بنانے والے نے اس کو اس طرح بنایا ہے کہ وہ کسی بھی میکانیکل توجیہ کو قبول نہیں کرتی۔ مثال کے طور پر پروفیسر جان مینارڈ اسمتھ نے اپنے مقالے میں لکھا ہے کہ نظریہ ارتقاء نا قابل حل اندرونی مسائل (built-in problems) سے دوچار ہے۔ کیونکہ ہمارے پاس نظریات ہیں۔ مگر ہمارے پاس وہ ذرائع نہیں کہ ہم حقیقی واقعات سے اپنے نظریات کی تصدیق کر سکیں۔

قرآن کے مطابق انسان اور دوسری تمام انواع خدا کی تخلیق ہیں۔ اس کے برعکس نظریہ ارتقاء زندگی کی تمام قسموں کو اندھے مادی عمل کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ قرآن کا جواب اپنی توجیہ آپ ہے۔ کیونکہ خدا ایک صاحب ارادہ ہستی ہے۔ وہ اسباب کا محتاج نہیں۔ وہ اپنی مرضی کے تحت کسی بھی واقعہ کو ظہور میں لا سکتا ہے۔ اس کے برعکس ارتقائی عمل کے لیے ضروری ہے کہ ہر واقعہ کے پیچھے اس کا کوئی سبب پایا جائے۔ چونکہ ایسے اسباب کی دریافت ممکن نہیں اس لیے نظریۂ ارتقاء اس دنیا میں بے توجیہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ ارتقاء کا نظریہ لازمی منطقی خلا سے دوچار ہے۔ جب کہ قرآن کے نظریہ میں کوئی منطقی خلا نہیں پایا جاتا۔

علم سیاست

یہی معاملہ فلسفہ سیاسیات کا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (1984) کے مقالہ نگار کے الفاظ میں سیاسی فلسفہ اور سیاسی اختلافات بنیادی طور پر ایک ہی سوال کے گرد گھومتے ہیں۔ یہ کہ کس کو کس کے اوپر اقتدار حاصل ہو:

Political philosophy and political conflict have revolved basically around who should have power over whom. (*Encyclopedia Britannica* vol. 14, p. 697)

اس میدانِ فکر میں پچھلے پانچ ہزار سال سے اعلیٰ ترین انسانی دماغ اپنی کوششیں صرف کر رہے ہیں۔اس کے باوجود علم سیاسیات کا مربوط نظام بنانے کے لیے وہ چیز دریافت نہ ہو سکی جس کو اسپنوزا نے علمی بنیاد(Scientific base) کہا ہے۔

علم سیاسیات میں ایک درجن سے زیادہ مدارس فکر پائے جاتے ہیں۔تاہم وسیع تقسیم میں وہ صرف دو ہیں۔ایک وہ جو شخصی اقتدار کی وکالت کرتے ہیں۔دوسرے وہ جو جمہوری اقتدار کے حامی ہیں۔ان دونوں ہی پر سخت ترین اعتراضات کیے جاتے ہیں۔ شخصی اقتدار کے نظریہ پر یہ اعتراض واقع ہوتا ہے کہ ایک انسان کو دوسرے انسان کے اوپر کیوں حاکمانہ اقتدار حاصل ہو۔چنانچہ وہ کبھی قبولیت عام حاصل نہ کر سکا۔دوسرا نظریہ وہ ہے جس کو جمہوری اقتدار کا نظریہ کہا جاتا ہے۔عملاً اگرچہ یہ ایک مقبول نظریہ ہے مگر نظری اور فکری اعتبار سے اس پر سخت ترین شبہات کا اظہار کیا گیا ہے۔

جمہوریت (ڈیموکریسی) کا نظریہ اس عقیدہ پر قائم ہے کہ تمام انسان آزاد ہیں اور برابر کے حقوق رکھتے ہیں۔روسو(Jean Jacques Rousseau, 1712-1778) کی کتاب معاہدہ عمرانی(*Social Contract*) کا پہلا فقرہ یہ ہے:

Man is born free; and everywhere he is in chain.

انسان آزاد پیدا ہوا ہے۔مگر میں اس کو زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھ رہا ہوں۔

ڈیموکریسی ایک یونانی لفظ ہے۔اس کے معنی ہیں حکومت بذریعہ عوام (Rule by the people)۔ مگر عملاً یہ ناممکن ہے کہ تمام عوام کی حکومت قائم ہو سکے۔ سارے لوگوں پر سارے لوگ آخر کس طرح حکومت کریں گے۔مزید یہ کہ انسان کے

بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک سماجی حیوان (social animal) ہے۔انسان اس دنیا میں اکیلا نہیں ہے کہ وہ جس طرح چاہے رہے۔بلکہ وہ سماجی مجموعہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ایک مفکر کے الفاظ میں،انسان آزاد نہیں پیدا ہوا ہے۔انسان ایک سماج کے اندر پیدا ہوتا ہے جو کہ اس کے اوپر پابندیاں عائد کرتا ہے:

Man is not born free; Man is born into society, which imposes restraints on him.

جب سارے عوام بیک وقت حکومت نہیں کر سکتے تو عوامی حکومت کا نظام کس طرح بنایا جائے۔اس سلسلے میں مختلف نظریے پیش کیے گئے۔سب سے زیادہ مقبول نظریہ روسو کا نظریہ ہے جس کو اس نے رائے عامہ (general will) کی بنیاد پر قائم کیا ہے۔یہ رائے عامہ حکمراں افراد کے انتخاب میں ظاہر ہوتی ہے۔اس طرح عوام کی حکومت عملاً منتخب افراد کی حکومت بن جاتی ہے۔عوام کو انتخاب میں ووٹ دینے کی کسی قدر آزادی ہوتی ہے۔مگر ووٹ دینے کے بعد وہ دوبارہ اپنے جیسے کچھ افراد کے محکوم بن جاتے ہیں۔روسو نے اس کا جواب یہ دیا کہ ایک شخص کی خواہش کی پیروی غلامی ہے۔مگر خود اپنے مقرر کردہ قانون کی پیروی کرنا آزادی ہے:

To follow one's impulse is slavery but to obey the self-prescribed law is liberty. (*Encyclopedia Britannica,* 15/1172)

ظاہر ہے کہ یہ جواب ناکافی تھا۔چنانچہ اس نظریہ کو دوبارہ سخت اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا۔کیوں کہ لوگ دیکھ رہے تھے کہ خوبصورت الفاظ کے باوجود منتخب جمہوریت عملاً

منتخب بادشاہت (elective monarchy) کا دوسرا نام ہے۔ انتخاب کے بعد جمہوری افراد وہی کچھ بن جاتے ہیں جو اس سے پہلے شاہی افراد بنے ہوئے تھے۔

اس طرح تمام سیاسی مفکرین فکری تضاد کا شکار ہیں جس سے نکلنے کا کوئی راستہ انھیں نظر نہیں آتا۔ اعتقادی طور پر سب کے سب مساوات انسانی کو اعلیٰ ترین قدر مانتے ہیں۔ مگر انسانی مساوات حقیقی معنوں میں نہ شاہی نظام میں حاصل ہوتی اور نہ جمہوری نظام میں۔ شاہی نظام اگر خاندانی بادشاہت ہے تو جمہوری نظام انتخابی بادشاہت۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں شاہی نظام کے خلاف زبردست بغاوت ہوئی۔ مگر جب شاہی افراد کی محکومی ختم ہوگئی تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ ان کے لیے دوسرا بدل صرف یہ ہے کہ نمائندہ افراد کی محکومی پر اپنے آپ کو راضی کرلیں۔ دونوں نظاموں میں جو فرق تھا وہ صرف یہ کہ نئے حکمران اپنے آپ کو زمین پر عوام کا نمائندہ کہتے تھے۔ جب کہ پرانے حکمرانوں کا کہنا تھا کہ وہ زمین پر خدا کے نمائندہ (representative of God on earth) ہیں۔

برٹانیکا کے مقالہ نگار نے اس معاملے میں انسان کی ناکامی کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ سیاسی فلسفہ کی تاریخ، افلاطون سے لے کر اب تک، ظاہر کرتی ہے کہ جدید سیاسی فلسفہ ابھی تک بنیادی مسائل سے دوچار ہے:

> The history of political philosophy from Plato until the present day makes plain that modern political philosophy is still faced with the basic problems. (*Encyclopedia Britannica,* 14/695)

جمہوریت عین مساواتِ انسانی ہی کے نام پر پیش کی گئی۔ مگر وہ اپنے اندرونی تضاد کی

وجہ سے برعکس نتیجے کا حامل ثابت ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک ہی فلسفہ ہے جو اس دنیا میں فکری تضاد سے خالی ہو سکتا ہے۔اور وہ قرآن کا فلسفہ ہے۔اس سلسلے میں قرآن یہ نظریہ پیش کرتا ہے:

يا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْناكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثى وَجَعَلْناكُمْ شُعُوباً وَقَبائِلَ لِتَعارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقاكُمْ إِنَّ اللهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ(49:13)۔ اے لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ اور تم کو قوموں اور خاندانوں میں تقسیم کر دیا، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ بیشک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ بیشک اللہ جاننے والا، خبر رکھنے والا ہے۔

تمام سیاسی نظریات کی کوشش یہ رہی ہے کہ وہ انسانوں کے درمیان حاکم اور محکوم کی تقسیم ختم کریں۔ مگر انسانی نظام میں یہ تقسیم کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ خواہ جو بھی سیاسی نظام بنایا جائے۔ یہ صورت ہمیشہ باقی رہے گی کہ کچھ لوگ ایک یا دوسرے نام پر حاکم بن جائیں گے اور بقیہ لوگ محکوم کی حیثیت اختیار کر لیں گے۔ مگر جب خدا کو رب العالمین مان لیا جائے تو یہ تقسیم ایک ریلیٹیو (relative) تقسیم ہو جاتی ہے۔اب ایک طرف خدا ہوتا ہے اور دوسری طرف انسان۔اب رب اور عبد کی تقسیم صرف خدا اور انسان کے درمیان رہتی ہے۔ باقی جہاں تک انسان اور انسان کے درمیان کا معاملہ ہے، سب انسان مساوی طور پر یکساں حیثیت کے مالک ہو جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان حاکم اور محکوم کی تقسیم ختم کرنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں کہ خدا کو بادشاہِ حقیقی مان کر سب انسان اپنے آپ کو اس کی ماتحتی

میں دیدیں۔ یہی واحد فطری نظریہ ہے جو فکری تضاد سے پاک ہے۔ دوسرا کوئی بھی نظریہ فکری تضاد سے خالی نہیں ہو سکتا۔

تضاد کی دو قسمیں

قرآن کی مذکورہ آیت (4:82) میں جس تضاد یا نامطابقت کا ذکر کیا گیا ہے، اس کے دو خاص پہلو ہیں، ایک داخلی اور دوسرا خارجی۔

داخلی غیر مطابقت یہ ہے کہ کتاب کا ایک بیان کتاب کے دوسرے بیان سے ٹکرا رہا ہو۔ خارجی غیر مطابقت یہ ہے کہ کتاب کا بیان خارجی دنیا کے حقائق سے ٹکرا جائے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ ان دونوں قسم کے تضادات سے خالی ہے۔ جب کہ کوئی بھی انسانی تصنیف ان سے خالی نہیں ہو سکتی۔ یہی واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن غیر انسانی ذہن سے نکلا ہوا کلام ہے۔ اگر وہ ایک انسانی کلام ہوتا تو یقیناً اس کے اندر بھی وہی کمی پائی جاتی جو تمام انسانی کلام میں غیر استثنائی طور پر پائی جاتی ہے۔

داخلی تضاد

کلام میں داخلی تضاد حقیقتاً متکلم کی شخصیت میں داخلی کمی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ داخلی تضاد سے بچنے کے لیے دو چیزیں لازمی طور پر ضروری ہیں، ایک کامل علم اور دوسرے کامل موضوعیت (objectivity)۔ کوئی انسان ان دونوں کمیوں سے خالی نہیں ہوتا۔ اس لیے انسان کا کلام داخلی تضاد سے پاک بھی نہیں ہوتا۔ یہ صرف خدا ہے جو تمام کمیوں سے پاک ہے۔ اس لیے صرف خدا کا کلام ہی وہ کلام ہے جو داخلی تضاد سے پوری طرح خالی ہے۔

انسان اپنی محدودیت کی وجہ سے بہت سی باتوں کو اپنی عقل کی گرفت میں نہیں لا سکتا۔اس لیے قیاسی طور پر کبھی وہ ایک بات کہتا ہے اور کبھی دوسری بات۔ہر انسان کا یہ حال ہے کہ وہ ناپختہ عمر سے پختہ عمر کی طرف سفر کرتا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ناپختہ عمر میں جو بات کہتا ہے، پختہ عمر کو پہنچ کر وہ خود اس کے خلاف بولنے لگتا ہے۔ہر آدمی کا علم اور تجربہ بڑھتا رہتا ہے اس بنا پر اس کا ابتدائی کلام کچھ ہو جاتا ہے اور آخری کلام کچھ۔انسان کی عمر بہت تھوڑی ہے۔اس کی واقفیت ابھی مکمل نہیں ہوتی کہ اس کی موت آجاتی ہے۔وہ اپنی نامکمل واقفیت کی بنا پر ایسی بات کہتا ہے جو اس کے بعد درست ثابت نہیں ہوتی۔

اسی طرح آدمی کو کسی سے دوستی ہوتی ہے اور کسی سے دشمنی۔وہ کسی سے محبت کرتا ہے اور کسی سے نفرت۔وہ کسی کے بارے میں سادہ ذہن کے تحت سوچتا ہے اور کسی کے بارے میں رد عمل کی نفسیات کا شکار ہو جاتا ہے۔انسان پر کبھی غم کا لمحہ گزرتا ہے اور کبھی خوشی کا۔وہ کبھی ایک ترنگ (emotion) میں ہوتا ہے اور کبھی دوسری ترنگ میں۔اس بنا پر انسان کے کلام میں یکسانیت نہیں ہوتی۔وہ کبھی ایک طرح کی بات کہتا ہے اور کبھی دوسری طرح کی بات بولنے لگتا ہے۔خدا ان تمام کمیوں سے پاک ہے اس لیے اس کا کلام ہمیشہ یکساں ہوتا ہے اور ہر قسم کے تناقض سے خالی بھی۔

حضرت مسیح کی شخصیت

مثال کے طور پر بائبل کو لیجیے۔بائبل اپنی ابتدائی حالت میں خدا کا کلام تھی۔مگر بعد کو اس میں انسانی ملاوٹ ہوئی۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس میں کثرت سے داخلی تضادات پیدا ہو گئے، بائبل کا وہ حصہ جس کو انجیل یا نیا عہد نامہ کہا جاتا ہے اس میں حضرت مسیح علیہ

السلام کا نسب نامہ دیا گیا ہے۔ یہ نسب نامہ متی کی انجیل میں اس طرح شروع ہوتا ہے —

یسوع مسیح ابن داؤد ابن ابرہام کا نسب نامہ (متی، 1:1)

یہ مختصر نسب نامہ ہے۔ اس کے بعد انجیل میں مفصل نسب نامہ ہے جو حضرت ابراہیم سے شروع ہوتا ہے۔ اور آخر میں "یوسف" پر ختم ہوتا ہے جو اس کے بیان کے مطابق مریم کے شوہر تھے جن سے حضرت مسیح پیدا ہوئے (متی، 16-1:2)۔

اس کے بعد قاری مرقس کی انجیل تک پہنچتا ہے تو وہاں کتاب کے آغاز میں حضرت مسیح کا نسب نامہ ان لفظوں میں ملتا ہے:

"یسوع مسیح ابن خدا" (مرقس، 1:1)

گویا انجیل کے ایک باب کے مطابق حضرت مسیح یوسف نامی ایک شخص کے فرزند تھے، اور اسی انجیل کے دوسرے باب کے مطابق حضرت مسیح ابن خدا (خدا کے بیٹے) تھے۔

انجیل اپنی ابتدائی صورت میں یقیناً خدائی کلام تھی اور تضادات سے پاک تھی۔ مگر بعد کو اس میں انسانی کلام شامل ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بیانات میں تضاد پیدا ہو گیا۔

انجیل کے اس تضاد کی تاویل کلیسا نے ایک اور عجیب و غریب تضاد سے کی ہے۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (1984) کے مطابق وہ مذکورہ یوسف کے لیے حسب ذیل الفاظ استعمال کرتے ہیں — مسیح کا ارضی باپ، کنواری مریم کا شوہر:

Christ's earthly father, the virgine Mary's husband.

کارل مارکس کا فکری تضاد

یہ مذہبی کلام میں داخلی تضاد کی مثال تھی۔اب غیر مذہبی کلام میں داخلی تضاد کی مثال لیجئے۔ یہاں میں کارل مارکس کا حوالہ دوں گا۔موجودہ زمانے میں کارل مارکس کی ذہنی عظمت کا حال یہ ہے کہ امریکی پروفیسر جان گال بریتھ نے مارکس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> If we agree that the Bible is a work of collective authorship, only Mohammad rivals Marx in the number of prefessed and devoted followers recruited by a single author. And the competition is not really very close. The followers of Marx now far outnumber the sons of the Prophet.
>
> Jhon Kenneth Galbraith, *The Age of Uncertainty*, BBC, London, p. 77.

اگر ہم یہ مان لیں کہ بائبل کئی اشخاص کی مشترکہ تصنیف ہے تو صرف محمد وہ دوسرے واحد مصنف ہیں جو معتقدین اور پیرؤوں کی تعداد کے اعتبار سے مارکس کی برابری کر سکتے ہیں۔ پھر مقابلہ زیادہ قریب قریب کا نہیں۔مارکس کے پیرؤوں کی تعداد آج پیغمبر کے پیرؤوں کی تعداد سے بہت زیادہ بڑھ چکی ہے۔

مگر ساری مقبولیت کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ مارکس کا کلام داخلی تضاد کا شاہکار ہے۔مارکس کے فکر میں اتنے زیادہ تضادات پائے جاتے ہیں کہ اس کے خیالات کو مجموعہ اضداد کہنا زیادہ صحیح ہو گا۔

مثال کے طور پر مارکس نے دنیا کی تمام خرابیوں کا سبب سماج میں طبقات کا ہونا بتایا

ہے۔یہ طبقات اس کے نزدیک انفرادی ملکیت کے نظام کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ایک طبقہ (بورژوا یا سرمایہ دار) ذرائع پیداوار قابض ہو کر دوسرے طبقہ (محنت کش طبقہ) کو لوٹتا ہے۔

اس کا حل مارکس نے یہ تجویز کیا کہ سرمایہ دار طبقہ سے اس کی ملکیتیں چھین لی جائیں اور ان کو مزدور طبقہ کے زیر انتظام دیدیا جائے۔اس کاروائی کو وہ بے طبقاتی سماج (Classless Society) قائم کرنے کا نام دیتا ہے۔مگر یہ کھلی ہوئی تضاد فکری ہے۔ کیونکہ مذکورہ کاروائی سے جو چیز وقوع میں آئے گی وہ بے طبقاتی سماج نہیں ہے۔بلکہ یہ ہے کہ معاشی ذرائع پر ایک طبقے کا قبضہ ختم ہو کر دوسرے طبقے کا قبضہ شروع ہو جائے۔یہ طبقات کا خاتمہ نہیں بلکہ صرف طبقات کی تبدیلی ہے،اس فرق کے ساتھ کہ پہلے یہ قبضہ ملکیت کے نام پر تھا اوراب یہ قبضہ انتظام کے نام پر ہو گا۔وہ چیز جس کو مارکس بے طبقاتی سماج کہتا ہے وہ عملاً سرمایہ دار طبقے کی ملکیت کو ختم کر کے کمیونسٹ طبقہ کی ملکیت قائم کرنے کے سوااور کچھ نہیں۔

مارکس ایک ہی چیز کو ایک جگہ برائی کہتا ہے اور دوسری جگہ بھلائی۔ مگر سرمایہ داروں کے خلاف شدید نفرت اور تعصب کی وجہ سے اس کو اپنا یہ فکری تضاد دکھائی نہیں دیا۔وہ ذرائع معاش کو سرمایہ داروں کے بجائے عہدیداروں کے قبضہ میں دے رہا تھا۔مگر اپنے متعصبانہ اندھے پن کی وجہ سے وہ اپنے اس تضاد کو محسوس نہ کر سکا۔ایک نوعیت کے دوواقعات میں سے ایک واقعہ کو اس نے انفرادی لوٹ کہااور دوسرے کو اجتماعی تنظیم۔

قرآن اس قسم کے داخلی تضاد سے مکمل طور پر خالی ہے۔اس کا کوئی بیان اس کے دوسرے بیان سے نہیں ٹکراتا۔قرآن کے تمام بیانات میں کامل قسم کی داخلی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

غیر متعلق مثال

قرآن کے مخالفین نے اس سلسلے میں بعض مثالیں دے کر قرآن کے اندر داخلی تضاد ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر یہ تمام کی تمام غیر متعلق مثالیں ہیں۔ گہرا تجزیہ فوراًان کی غلطی واضح کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن نے ایک طرف یہ اعلیٰ اصول پیش کیا کہ تمام انسان برابر ہیں۔ قرآن میں یہ کہا گیا ہے کہ اے لوگو، اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اس جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں (4:1)۔ حدیث (خطبہ حجۃ الوداع) میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمام لوگ آدم سے ہیں اور آدم مٹی سے تھے:

النَّاسُ مِنْ آدَمَ، وَآدَمُ مِنْ تُرَابٍ (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 412)۔

اس اصول کے مطابق عورت کا بھی وہی درجہ ہونا چاہیے جو مرد کا درجہ ہے۔ مگر عملاً ایسا نہیں۔ ایک طرف قرآن مساوات انسانی کا علم بردار ہے اور دوسری طرف اس نے عورت کو سماج میں کم تر مقام دے دیا۔ چنانچہ گواہی کے معاملہ میں یہ قانون مقرر کیا کہ دو عورت کی گواہی ایک مرد کے برابر مانی جائے گی۔

یہ سراسر غلط فہمی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام میں عام حالات میں دو عورت کی گواہی ایک مرد کے برابر مانی گئی ہے مگر اس کی بنیاد صنفی امتیاز پر نہیں ہے۔ بلکہ اس کی وجہ قطعی طور پر دوسری ہے۔ یہ حکم قرآن کی جس آیت میں ہے وہیں اس کی وجہ بھی بتادی گئی ہے۔ وہ آیت یہ ہے:

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاۗءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى (2:282)۔ (جب تم ادھار کا معاملہ کرو تو اس کو لکھ لیا کرو) اور اپنے مردوں میں سے دو مرد کو گواہ بنالو۔ اور اگر دو مرد گواہ نہ ملیں تو ایک مرد اور دو عورتیں، ایسے گواہوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو، تاکہ ان دونوں عورتوں میں سے کوئی اگر بھول جائے تو دوسری عورت اس کو یاد دلا دے۔

آیت کے الفاظ واضح طور پر بتاتے ہیں کہ اس حکم کی بنیاد صنفی امتیاز پر نہیں بلکہ صرف یادداشت پر ہے۔ آیت اس حیاتیاتی (biological) حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ عورتوں کی یادداشت عام طور پر مردوں سے کم ہوتی ہے۔ اس لیے قرض کے معاملہ میں عورت کو گواہی میں لینا ہو تو ایک مرد کی جگہ دو عورتیں گواہ مقرر کی جائیں۔ تاکہ آئندہ جب کبھی گواہی دینا ہو تو دونوں مل کر ایک دوسرے کی یادداشت کی کمی کی تلافی کر سکیں۔

یہاں میں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ جدید تحقیقات نے اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ مرد کے مقابلے میں عورت کی یادداشت کم ہوتی ہے۔ روس میں اس موضوع پر باقاعدہ سائنسی تحقیق کی گئی ہے اور نتائجِ تحقیق کتاب کی صورت میں شائع کیے گئے ہیں۔ اس تحقیق کا خلاصہ اخبارات میں آ چکا ہے۔ نئی دہلی کے اخبار ٹائمس آف انڈیا میں یہ خلاصہ حسبِ ذیل الفاظ میں شائع ہوا ہے:

MEMORISING ABILITY: Men have a greater ability to memories and process mathematical

information than women but females are better with words a Soviet scientist says, reports UPI. Men dominate mathematical subjects due to the peculiarities of their memory. Dr. Vladimir Konovalov told the Tass news agency. (*Times of India*, 18th Jan 1985)

عورتوں کے مقابلے میں مردوں کے اندر اس بات کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ ریاضیاتی معلومات کو یاد رکھیں اور اس کو ترکیب دے سکیں۔ مگر عورتیں الفاظ میں زیادہ بہتر ہوتی ہیں۔ یہ بات ایک روسی سائنسداں نے کہی ۔ڈاکٹر ولادیمیر کونوولوف نے تاس نیوز ایجنسی کو بتایا کہ مرد ریاضیاتی موضوعات پر چھائے ہوئے ہیں۔اس کی وجہ ان کے اندر حافظہ کی خصوصی صلاحیت ہے۔

جب یہ ایک حیاتیاتی واقعہ ہے کہ عورت کی یادداشت فطری طور پر مرد سے کم ہوتی ہے تو یہ عین مطابق حقیقت بات ہے کہ دو عورت کی گواہی ایک مرد کے برابر رکھی جائے۔ قرآن کا یہ قانون قرآن میں تضاد ثابت نہیں کرتا۔ بلکہ یہ ثابت کرتا ہے کہ قرآن ایک ایسی ہستی کی طرف سے آیا ہوا کلام ہے جو تمام حقیقتوں سے باخبر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کے احکام میں تمام پہلوؤں کی پوری رعایت پائی جاتی ہے۔

خارجی نامطابقت

اس معاملے کا دوسرا پہلو خارجی نامطابقت ہے۔ یعنی کسی امر میں کتاب کے اندر جو بات کہی گئی ہے وہ کتاب کے باہر پائی جانے والی حقیقت کے مطابق نہ ہو۔ یہ ایک ایسی کمی ہے جو تمام انسانی تصنیفات میں پائی جاتی ہے۔ انسان اپنی معلومات کے دائرے میں بولتا

ہے۔اور انسان کی معلومات کا دائرہ چونکہ محدود ہے۔اس لیے اس کی زبان یا قلم سے ایسی باتیں نکلتی رہتی ہیں جو خارجی صورت حال سے مطابقت نہ رکھتی ہوں۔ یہاں ہم چند تقابلی مثالیں بیان کریں گے۔

قانونِ فطرت کی مثال

قدیم عرب میں ایک رواج یہ تھا کہ بعض اوقات کوئی شخص اپنی اولاد کو اس اندیشے سے قتل کر دیتا تھا کہ افراد خاندان زیادہ ہو جائیں گے تو ان کے لیے کھانے پینے کا انتظام نہ ہو سکے گا۔اس سلسلے میں قرآن میں یہ حکم اترا:

> وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا (17:31) ۔اپنی اولاد کو مفلسی کے اندیشے سے قتل نہ کرو ہم ان کو بھی روزی دیں گے اور تم کو بھی۔بے شک ان کو مار ڈالنا ایک بڑی غلطی ہے۔

یہ اعلان گویا ایک قسم کا دعویٰ تھا۔اس کا مطلب یہ تھا کہ مستقبل میں آبادی کا کوئی بھی اضافہ زمین پر رزق کی تنگی کا مسئلہ پیدا نہیں کرے گا۔انسانی تعداد کے مقابلے میں غذائی اشیاء کا تناسب ہمیشہ موافق طور پر برقرار رہے گا جس طرح آج سب کو ان کی روزی مل رہی ہے اسی طرح آئندہ بھی سب کو ان کی روزی ملتی رہے گی۔

مسلمان ہر دور میں اعتقادی طور پر اس اعلان کی صداقت کو مانتے رہے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں کبھی بھی وہ ذہن پیدا نہیں ہوا جس کو موجودہ زمانے میں تحدید نسل یا

برتھ کنٹرول کہتے ہیں۔ وہ خدا کی رزاقی پر بھروسہ کرتے ہوئے رزق کے معاملے کو خدا پر چھوڑتے رہے ہیں۔ مگر اس اعلان کے ایک ہزار سال بعد انگریز ماہر معاشیات رابرٹ مالتھس (1766-1834) میں پیدا ہوا۔ 1798 میں "اصول آبادی" پر اس کی مشہور کتاب چھپی جس کا پورا نام یہ ہے:

An Essay on the Principle of Population as It Affects the Future Improvement of Society.

مالتھس نے اپنی مشہور کتاب میں وہ مشہور نظریہ پیش کیا جس کا خلاصہ اس کے الفاظ میں یہ تھا:

Population when unchecked increases in a geometrical ratio. Subsistence only increases in an arithmetical ratio.

آبادی، جب کہ وہ بے قید طور پر چھوڑ دی جائے، جیو میٹری کے تناسب سے بڑھتی ہے۔ اشیاء خوراک صرف ارتھیمٹک کے تناسب سے بڑھتی ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا اضافہ اور غذائی اشیاء کا اضافہ قدرتی طور پر یکساں نہیں ہے۔ انسانی آبادی کا اضافہ 1۔2۔4۔8۔16۔32۔64 کے تناسب سے ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، غذائی اشیاء میں اضافہ کا تناسب 1۔2۔3۔4۔5۔6۔7۔8۔ رہتا ہے۔ یعنی انسانی آبادی میں اضافہ نہایت تیز رفتار ہوتا ہے اور غذائی اشیاء میں اضافہ نہایت سست رفتار۔ اس بنا پر مالتھس نے کہا کہ زمین پر انسانی نسل کو بچانے کے لیے ضروری ہے کہ پیدائش پر کنٹرول قائم کیا جائے۔ انسان کی تعداد کو ایک خاص حد سے آگے بڑھنے نہ دیا

جائے۔ ورنہ بہت جلد ایسا ہوگا کہ آبادی اور غذائی اشیاء میں غیر متناسب اضافہ کی وجہ سے فاقہ کا دور شروع ہو جائے گا اور بے شمار انسان بھوک سے مرنے لگیں گے۔

مالتھس کی اس کتاب نے دنیا کی فکر پر زبردست اثر ڈالا۔ اس کی تائید میں بے شمار لکھنے اور بولنے والے پیدا ہو گئے۔ یہاں تک کہ ساری دنیا میں برتھ کنٹرول اور فیملی پلاننگ کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ مگر اب محققین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس کا اندازہ سراسر غلط تھا۔ مسٹر گوائن ڈائر (Gwynne Dyer) نے ان تحقیقات کا خلاصہ ایک مقالے کی صورت میں شائع کیا ہے۔ اس مقالے کا عنوان بامعنی طور پر یہ ہے — مالتھس جھوٹا پیغمبر:

Malthus: The False Prophet

مقالہ نگار جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> It is the 150th anniversary of Malthus's death and his grim predictions have not yet come true. The world's population has doubled and redoubled in a geometrical progression as he fore saw. only slightly checked by wars and other catastrophes, and now stands at about eight times the total when he wrote. But food production has more than kept pace and the present generation of humanity is on average the best fed in history. (*Hindustan Times,* 28th Dec 1984)

مالتھس کی موت کو اب 150 سال گزر چکے ہیں اور اس کی سنگین پیشن گوئیاں ابھی تک پوری نہیں ہوئیں۔ دنیا کی آبادی جیومیٹری کے حساب سے دوگنی اور چوگنی ہو گئی جیسا کہ اس نے کہا تھا، اس میں جنگوں اور حوادث کی وجہ سے بس تھوڑا سا فرق پڑا ہے۔ جب

مالتھس نے اپنی کتاب لکھی تھی اس وقت کی آبادی کے مقابلے میں آج کی دنیا کی آبادی تقریباً آٹھ گنا ہو چکی ہے۔ مگر غذائی پیداوار بھی کچھ اضافہ کے ساتھ ساتھ قدم بقدم چلتی رہی ہے۔اور انسان کی موجودہ نسل کو اوسط طور پر تاریخ کی سب سے بہتر غذا مل رہی ہے۔(ہندوستان ٹائمس 28 دسمبر 1984)

رابرٹ مالتھس "روایتی زراعت" کے دور میں پیدا ہوا۔ وہ اس کا اندازہ نہ کر سکا کہ جلد ہی "سائنٹفک زراعت" کا دور آنے والا ہے جس کے بعد پیداوار میں غیر معمولی اضافہ کرنا ممکن ہو جائے گا۔ پچھلے ڈیڑھ سو سال میں زراعت کے طریقوں میں انقلابی تبدیلیاں ہوئی ہیں اب ایسے منتخب بیج بوئے جاتے ہیں جو زیادہ فصل دینے والے ہوں۔ یہی معاملہ مویشیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ کھیتوں کو زرخیز کرنے کے مزید طریقے دریافت ہو گئے ہیں۔ نئی نئی کھادیں بڑے پیمانے پر استعمال ہونے لگی ہیں۔ مشین کی مدد سے ان مقامات پر کھیتی ہونے لگی ہے جہاں پہلے کھیتی کرنا ناممکن نظر آتا تھا۔ آج ترقی یافتہ ملکوں میں کسانوں کی تعداد میں 90 فی صد تک کمی کرنے کے باوجود زرعی پیداوار کو دس گنا تک بڑھا لیا گیا ہے، وغیرہ۔

تیسری دنیا (غیر ترقی یافتہ ممالک) کا جو رقبہ ہے اس کے لحاظ سے اس میں 33 بلین انسانوں کی آبادکاری کی گنجائش ہے جب کہ اس کی موجودہ آبادی صرف 3 بلین ہے۔ تیسری دنیا امکانی طور پر اپنی موجودہ آبادی کی دس گنا تعداد کو خوراک مہیا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اقوام متحدہ کے ادارہ برائے خوراک وزراعت (FAO) نے اندازہ لگایا ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک کی آبادی اگر بے قید طور پر بڑھتی رہے اور 2000ء میں

چار بلین سے زیادہ ہو جائے تب بھی کوئی خطرہ کی بات نہیں۔ کیونکہ اندازہ کے مطابق، اس وقت جو آبادی ہو گی اس سے ڈیڑھ گنا آبادی کو خوراک مہیا کرنے کے ذرائع پھر بھی تیسری دنیا کے علاقے میں موجود ہوں گے۔

خوراک میں یہ اضافہ جنگلوں کو کاٹے بغیر ممکن ہو سکے گا۔ اس لیے حقیقت یہ ہے کہ نہ تو عالمی سطح پر کسی غذائی بحران کا کوئی حقیقی اندیشہ ہے اور نہ علاقائی سطح پر۔ مسٹر گوائن ڈائر نے اپنی رپوٹ ان الفاظ پر ختم کی ہے:

Malthus was wrong. We are not doomed to breed ourselves into famine.

مالتھس غلطی پر تھا، ہمارے لیے یہ مقدر نہیں کہ ہماری اگلی نسلیں قحط میں پیدا ہوں۔

یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ مالتھس کی کتاب "اصول آبادی" انسانی ذہن کی پیداوار تھی جو زبان و مکان کے اندر رہ کر سوچتا ہے۔ اس کے برعکس قرآن ایک ایسے ذہن سے نکلا ہوا کلام ہے جو زمان و مکان سے بلند ہو کر سوچنے کی طاقت رکھتا ہے۔ یہی فرق اس بات کا سبب ہے کہ مالتھس کا کلام خارجی حقیقت سے ٹکرا گیا اور قرآن آخری حد تک خارجی حقیقتوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ قرآن کے بیان اور خارجی واقعہ میں کوئی ٹکراؤ نہیں۔

کتب مقدسہ کی مثال

بنی اسرائیل حضرت یوسف کے زمانہ میں 20 ویں صدی قبل مسیح میں مصر میں داخل ہوئے اور حضرت موسیٰ کے زمانے میں تیرھویں صدی قبل مسیح میں مصر سے نکل

کر صحرائے سینا میں گئے۔ یہ دونوں واقعات بائبل میں بھی مذکور ہیں اور قرآن میں بھی۔ مگر قرآن کے بیانات خارجی تاریخ سے کامل مطابقت رکھتے ہیں۔ جب کہ بائبل میں کئی باتیں ایسی ہیں جو خارجی تاریخی واقعات سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ چنانچہ بائبل کے معتقدین کے لیے یہ مسئلہ پیدا ہو گیا ہے کہ وہ بائبل کے بیان کو لیں یا تاریخ کے بیان کو، کیونکہ دونوں کو بیک وقت لینا ممکن نہیں ہے۔

12 جنوری 1985ء کو نئی دہلی کے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز (تغلق آباد) میں اجتماع تھا۔ اس اجتماع کے مقرر مسٹر عذرا کولٹ (Ezra Kolet, 1914-1992) تھے، جو ہندوستان میں آباد یہودیوں کی مجلس (Council of Indian Jewry) کے صدر رہیں۔ تقریر کا عنوان تھا:

What is Judaism?

یہودی مقرر نے اپنی تقریر میں قدرتی طور پر یہودیوں کی تاریخ بیان کی۔ انہوں نے مصر میں ان کے جانے اور پھر وہاں سے نکلنے کا بھی تذکرہ کیا۔ اس سلسلے میں حضرت یوسفؑ اور حضرت موسیٰ کا ذکر آیا تو انہوں نے حضرت یوسف کے ہم عصر مصری بادشاہ کو بھی فرعون کہا اور حضرت موسیٰ کے ہم عصر مصری بادشاہ کو بھی فرعون بتایا۔

ہر صاحبِ علم جانتا ہے کہ یہ بات تاریخی اعتبار سے غلط ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ "فرعون" نام کے بادشاہ صرف بعد کو حضرت موسیٰ کے زمانے میں ہوئے۔ اس سے پہلے حضرت یوسف کے زمانے میں دوسرے لوگ مصر کے حکمراں تھے۔

حضرت یوسف جس زمانے میں مصر میں داخل ہوئے اس زمانے میں وہاں ان

لوگوں کی حکومت تھی جن کو تاریخ میں چرواہے بادشاہ (Hyksos Kings) کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ عرب نسل سے تعلق رکھتے تھے اور باہر سے آکر مصر پر قابض ہو گئے تھے۔ یہ خاندان دو ہزار سال قبل مسیح سے لے کر پندرھویں صدی قبل مسیح کے آخر تک مصر میں حکمران رہا۔ اس کے بعد مصر میں غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف بغاوت ہوئی اور ہکسوس کی حکومت ختم کر دی گئی۔

اس کے بعد مصر میں ملک والوں کی حکومت قائم ہوئی۔ اس وقت جس خاندان کو مصر کی بادشاہی ملی اس نے اپنے حکمرانوں کے لیے فرعون کا لقب پسند کیا۔ فرعون کے لفظی معنی سورج دیوتا کی اولاد کے ہیں۔ اس زمانے میں مصر کے لوگ سورج کو پوجتے تھے۔ چنانچہ حکمرانوں نے یہ ظاہر کیا کہ وہ سورج دیوتا کا مظہر ہیں۔ تاکہ مصریوں کے اوپر اپنا حق حکومت ثابت کیا جا سکے۔

مسٹر عذرا کولٹ نے جو کچھ کیا وہ مجبور تھے کہ ویسا ہی کریں۔ کیونکہ بائبل میں ایسا ہی لکھا ہوا ہے۔ بائبل حضرت یوسف کے ہم زمانہ مصری بادشاہ کو بھی فرعون کہتی ہے۔ اور حضرت موسیٰ کے ہم زمانہ مصری بادشاہ کو بھی فرعون کہتی ہے۔ مسٹر عذرا کولٹ یا تو بائبل کو لے سکتے تھے یا تاریخ کو۔ دونوں کو ساتھ لینا ممکن نہ تھا۔ انہوں نے یہودی کونسل کا صدر ہونے کی حیثیت سے تاریخ کو چھوڑا اور بائبل کو اختیار کر لیا۔

مگر قرآن اس قسم کے اختلاف بیانی سے خالی ہے۔ اس لیے حاملینِ قرآن کے لیے یہ مسئلہ نہیں کہ قرآن کو لینے کے لیے انہیں تاریخی حقیقت کو چھوڑنا پڑے۔ قرآن کے زمانہ نزول میں یہ تاریخی واقعات لوگوں کو معلوم نہ تھے۔ یہ تاریخ ابھی تک قدیم آثار کی

صورت میں زمین کے نیچے دفن تھی جن کو بہت بعد کو زمین کی کھدائی سے برآمد کیا گیا۔ اور ان کی بنیاد پر مصر کی تاریخ مرتب کی گئی۔

اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن میں حضرت یوسف کے ہم زمانہ مصری بادشاہ کا ذکر آتا ہے تو قرآن اس کے لیے ملکِ مصر (مصر کا بادشاہ) کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ اور حضرت موسیٰ کے ہم زمانہ مصری بادشاہ کا ذکر آتا ہے تو وہ اس کو بار بار فرعون کہتا ہے۔ اس طرح قرآن کا بیان خارجی تاریخی حقیقت کے عین مطابق ٹھہرتا ہے۔ جب کہ بائبل کا بیان خارجی تاریخی حقیقت سے ٹکرا رہا ہے۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ قرآن کا مصنف ایک ایسا مصنف ہے جو انسانی معلومات کے ماورا تمام حقیقتوں کو براہِ راست دیکھ رہا ہے۔

تاریخ کی مثال

نظریہ ارتقاء کے مطابق انسان اور حیوان دونوں ایک مشترک مورث اعلیٰ سے تعلق رکھتے ہیں۔ حیوانات کی ایک نسل ترقی کرتے کرتے بندر (چمپینزی) تک پہنچی۔ اور بندر کی یہ نسل مزید ترقی کرتے کرتے انسان بن گئی۔

اس سلسلے میں ایک سوال یہ ہے کہ اگر یہ واقعہ ہے تو حیوان اور انسان کی درمیانی کڑیاں کہاں ہیں۔ یعنی وہ انواع کون سی ہیں جو ابھی ارتقاء کے درمیانی سفر میں تھیں اور اس بنا پر ان کے اندر کچھ حیوانی پہلو تھے اور کچھ انسانی۔ اگرچہ حقیقی طور پر ابھی ایسی کوئی درمیانی نوع دریافت نہیں ہوئی ہے۔ تاہم علماء ارتقاء کو یقین ہے کہ ایسی انواع گزری ہیں۔ البتہ ان کا سراغ انہیں ابھی تک نہیں ملا ہے۔ ان مفروضہ کڑیوں کو غلط طور پر گم شدہ کڑیوں (missing links) کا نام دیا گیا ہے۔

1912ء میں لندن کے اخبارات نے جوپر جوش طور پر یہ خبر دی کہ بندر اور انسان کے درمیان کی ایک گمشدہ کڑی دریافت ہو گئی ہے۔ یہ وہی کڑی ہے جس کو ارتقاء کی تاریخ میں پلٹ ڈاؤن انسان(Piltdown Man) کہاجاتاہے۔اس کی حقیقت یہ تھی کہ لندن کے برٹش میوزیم کو قدیم زمانے کا ایک جبڑا ملا جس کا ڈھانچہ بندر جیسا تھا مگر اس کا دانت انسان کے دانت سے مشابہ تھا۔اس ہڈی کے ٹکڑے کی بنیاد پر ایک پوری تصویر بنائی گئی جو دیکھنے والوں کو بندر نماانسان یاانسان نمابندر دکھائی دیتی تھی۔اس کو پلٹ ڈاؤن انسان کانام دیا گیا۔ کیوں کہ وہ پلیٹ ڈاؤن نامی مقام سے حاصل ہوا تھا۔

پلٹ ڈاؤن انسان کو تیزی سے مقبولیت حاصل ہوئی۔وہ باقاعدہ طور پر نصاب کی کتابوں میں شامل کر لیا گیا۔مثال کے طور پر آر ایس لل(R.S.Lull) کی کتاب عضویاتی ارتقاء (*Organic Evolution*)میں۔ بڑے بڑے علماء و مفکرین نے اس کو جدید انسان کی علمی فتوحات میں شمار کیا۔ مثلاًایچ.جی.ویلز(1866-1946)نے اپنی کتاب،تاریخ کا خاکہ (*The Outline of History*)میں،اور برٹرینڈررسل(1872-1970)نے اپنی کتاب ، مغربی فلسفہ کا تاریخ(*A History of Western Philosphy*) میں۔تاریخ اور حیاتیات کی کتابوں میں پلٹ ڈاؤن انسان کا ذکر اس طرح کیا جانے لگا جیسے کہ وہ ایک مسلمہ حقیقت ہو۔

تقریباًنصف صدی تک جدید علماء اس "عظیم دریافت" سے مسحور رہے۔ یہاں تک کہ 1953ء میں بعض علماء کو شبہ ہوا۔انہوں نے برٹش میوزیم کے آہنی فائر پروف بکس سے مذکورہ جبڑا نکالا۔اس کو سائنسی طریقے سے جانچا۔تمام متعلق پہلوؤں سے اس کی تحقیق

کی۔آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ مکمل طور پر ایک فریب تھا جس کو حقیقت سمجھ لیا گیا۔

پلٹ ڈاؤن انسان کی اصل حقیقت یہ تھی کہ ایک شخص نے بندر کا ایک جبڑا لیا۔اس کو مہوگنی رنگ میں رنگا اور پھر اس کے دانت کو ریتی سے گھس کر آدمی کے دانت کی طرح بنایا۔اس کے بعد اس نے یہ جبڑا یہ کہہ کر برٹش میوزیم کے حوالے کر دیا کہ یہ اس کو پلٹ ڈاؤن (انگلینڈ) میں ملا ہے۔

یہ ایک بڑی دلچسپ کہانی ہے۔اس کی تفصیل کے لیے چند حوالے یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

1. *Encylopaedia Britanica*(1984)"Piltdown Man"
2. Bulletin of the British Museum (Natural History) Vol. 2, No. 3 and 6
3. J.S Weiner, *The Piltdown Forgery*(11955)
4. Ronald Millar, *The Piltdown Men*(1972)
5. *Reader's Digest*, November 1956

فرعون موسیٰ

اس کے مقابلے میں اب قرآن سے اسی نوعیت کی ایک مثال لیجیے۔یہ فرعون موسیٰ کی مثال ہے۔اس کے بارے میں قرآن میں جو الفاظ آئے تھے، بعد کی تاریخ حیرت انگیز طور پر اس کی تصدیق بن گئی۔

تاریخ کے مطابق حضرت موسیٰ کے زمانے میں مصر کا جو بادشاہ غرق ہوا وہ رعمیس دوم کا فرزند تھا۔اس کا خاندانی لقب فرعون اور ذاتی نام مر نفتاح (Merneptah)

تھا۔ نزولِ قرآن کے وقت اس فرعون کا ذکر صرف بائبل کے محفوظات میں تھا۔ اس میں بھی صرف یہ لکھا ہوا تھا کہ "خداوند نے سمندر کے بیچ ہی میں مصریوں کو تہہ و بالا کر دیا اور فرعون کے سارے لشکر کو سمندر میں غرق کر دیا" (خروج، 14:28)۔

اس وقت قرآن نے حیرت انگیز طور پر یہ اعلان کیا کہ فرعون کا جسم محفوظ ہے اور وہ دنیا والوں کے لیے سبق بنے گا:

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً (10:92)۔ آج ہم تیرے بدن کو بچالیں گے تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لیے نشانی ہو۔

قرآن میں جب یہ آیت اتری تو وہ نہایت عجیب تھی۔ اس وقت کسی کو بھی یہ معلوم نہ تھا کہ فرعون کا جسم کہیں محفوظ حالت میں موجود ہے۔ اس آیت کے نزول پر اسی حالت میں تقریباً چودہ سو سال گزر گئے۔ پروفیسر لاریٹ (Victor Loret, 1859-1946) پہلا شخص ہے جس نے 1898ء میں مصر کے ایک قدیم مقبرہ میں داخل ہو کر دریافت کیا کہ یہاں مذکورہ فرعون کی لاش ممی کی ہوئی موجود ہے۔ 8 جولائی 1907ء کو الیٹ اسمتھ (Sir Grafton Elliot Smith, 1871-1937) نے اس لاش کے اوپر لپٹی ہوئی چادر کو ہٹایا۔ اس نے اس کی باقاعدہ سائنسی تحقیق کی اور پھر 1912ء میں ایک کتاب شائع کی جس کا نام ہے — شاہی ممیاں:

The Royal Mummies, 1912, 118 pages

اس سے ثابت ہو گیا کہ یہ ممی کی ہوئی لاش اسی فرعون کی ہے جو تین ہزار سال پہلے حضرت موسیٰ کے زمانے میں غرق کیا گیا تھا۔ ایک مغربی مفکّر کے الفاظ میں:

His earthly remains were saved by the will of God from destruction to become a sign to man, as it is written in the Qur'an.

فرعون کا مادی جسم خدا کی مرضی کے تحت برباد ہونے سے بچا لیا گیا تاکہ وہ انسان کے لیے ایک نشانی ہو، جیسا کہ وہ قرآن میں لکھا ہوا ہے۔

قرآن اور بائبل اور سائنس(*The Bible, the Quran, and Science*) کے مصنف ڈاکٹر موریس بوکائلے(Maurice Bucaille)نے 1975ء میں فرعون کی اس لاش کا معائنہ کیا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی کتاب میں اس پر جو باب لکھا ہے اس کا خاتمہ ان پُراہتزاز سطروں پر ہوا ہے۔

Those who seek among modern data for proof of the veracity of the Holy Scriptures will find a magnificent illustration of the verses of the Quran dealing with the Pharoah's body by visiting the Royal Mummies Room of the Egyption Museum, Cairo!

وہ لوگ جو مقدس کتابوں کی سچائی کے لیے جدید ثبوت چاہتے ہیں وہ قاہرہ کے مصری میوزیم میں شاہی ممیوں کے کمرہ کو دیکھیں، وہاں وہ قرآن کی ان آیتوں کی شاندار تصدیق پا لیں گے جو کہ فرعون کے جسم سے بحث کرتی ہیں۔

قرآن نے ساتویں صدی عیسوی میں کہا کہ فرعون کا جسم لوگوں کی نشانی کے لیے محفوظ ہے، اور وہ انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں نہایت صحت کے ساتھ برآمد ہو

گیا۔ دوسری طرف موجودہ زمانے کے علماء سائنس نے اعلان کیا کہ پلٹ ڈاؤن کے مقام پر انہوں نے ایک ڈھانچہ دریافت کیا ہے، جو قدیم انسان کے جسم کا ایک حصہ ہے۔ اور اگلی معلومات کے تحت وہ بالکل بے بنیاد ثابت ہو گیا۔

کیا اس کے بعد بھی اس میں کوئی شبہ باقی رہتا ہے کہ قرآن ایک خدائی کتاب ہے۔ وہ عام انسانی تصنیفات کی طرح کوئی انسانی تصنیف نہیں۔

علم الحیات کی مثال

قدیم زمانے میں جب کہ موجودہ سائنسی مشاہدات سامنے نہیں آئے تھے، ساری دنیا میں توہماتی خیالات پھیلے ہوئے تھے۔ لوگوں نے بلا تحقیق عجیب عجیب نظریات قائم کر لیے تھے۔ یہ نظریات دوبارہ وقت کی کتابوں میں ظاہر ہوتے تھے۔ جو شخص بھی اس زمانے میں کوئی کتاب لکھتا تو ماحول کے زیرِ اثر وہ ان خیالات کو بھی دہرانے لگتا تھا۔

مثال کے طور پر ارسطو (322-384 ق م) نے ایک موقع پر پیٹ میں پرورش پانے والے بچوں کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ وقت کے رواجی فکر کے مطابق یہ کہتا ہے کہ پیٹ کے بچوں کی صحت کا تعلق ہواؤں سے ہے۔ ارسطو کے اس خیال کا مذاق اڑاتے ہوئے برٹرینڈ رسل نے لکھا ہے:

> He said that children will be healthier if conceived when the wind is in the north. One gathers that the two Mrs Aristotles both had to run out and look at the weathercock every evening before going to bed. (*The Impact of Science on Society*, 1953, p. 7)

ارسطو نے کہا کہ بچے زیادہ تندرست ہوں گے اگر شمالی رُخ پر ہوا چلنے کے وقت ان کا حمل قرار پائے۔ایک شخص اس سے قیاس کر سکتا ہے کہ ارسطو کی دونوں بیویاں ہر شام کو بستر پر جانے سے پہلے دوڑ کر باہر جاتی ہوں گی اور دیکھتی ہوں گی کہ ہوا کا رُخ کس سمت میں ہے۔قرآن اسی قدیم زمانے میں اُترا۔اس میں علم کی مختلف شاخوں سے متعلق کثرت سے حوالے موجود ہیں، مگر قرآن میں کوئی ایک بھی مثال نہیں ملتی جس میں وقت کے رواجی خیالات کا انعکاس پایا جاتا ہو۔

اجسامِ فلکی کی گردش

قرآن (21:33; 36:40) میں سورج اور چاند کا ذکر کرکے ارشاد ہوا ہے کہ سب ایک ایک دائرہ میں تیر رہے ہیں (وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ)۔ڈاکٹر موریس بوکائلے نے ان آیات پر تفصیلی کلام کیا ہے اور دکھایا ہے کہ یہاں فلک سے وہی چیز مراد ہے جس کو موجودہ زمانہ میں مدار (Orbit) کہا جاتا ہے۔اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:

It is shown that the sun move moves in an orbit, but no indication is given as to what this orbit might be in relation to the Earth. At the time of the Qur'anic Revelation, it was thought that the Sun moved while the Earth stood still. This was the system of geocentrism that had held sway since the time of Ptolemy, second century B.C., and was to continue to do so untill Copernicus in the sixteenth century A.D. Although people supported this concept at the time of Muhammad,

it does not appear anywhere in the Qur'anic, either here or elsewhere. (*The Bible, The Qur'an and Science*, p.159)

مذکورہ آیات میں یہ دکھایا گیا ہے کہ سورج ایک مدار میں گھومتا ہے۔ مگر اس بات کا کوئی اشارہ نہیں دیا گیا ہے کہ زمین کی نسبت سے اس کا مدار کیا ہے۔ قرآن کے نزول کے زمانے میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ سورج (زمین کے گرد) گھوم رہا ہے، جب کہ زمین ٹھہری ہوئی ہے۔ یہ مرکزِیت ارضی کا نظام تھا جو دوسری صدی قبل مسیح میں ٹالمی کے زمانے سے چھا گیا تھا۔ وہ سولہویں صدی عیسوی میں کوپرنیکس تک باقی رہا۔ اگرچہ محمد کے زمانے میں لوگ اس نظریہ کی تائید کرتے تھے مگر قرآن میں وہ کہیں ظاہر نہیں ہوا۔ نہ ان دونوں آیتوں میں اور نہ کسی اور آیت میں۔

جنینی ارتقاء

اس سلسلے میں ایک دلچسپ مثال وہ ہے جو 1984ء کے آخر میں مختلف اخبارات میں شائع ہوئی تھی۔ کناڈا کے اخبار دی سٹی زن (22 نومبر 1984) نے اس کی سرخی ان الفاظ میں قائم کی:

Ancient Holy Book 1300 Years Ahead of its Time.

(قدیم مقدس کتاب اپنے وقت سے 13 سو سال آگے)۔ اسی طرح نئی دہلی کے اخبار ٹائمس آف انڈیا (10 دسمبر 1984ء) میں یہ خبر حسبِ ذیل سرخی کے ساتھ چھپی:

Kor'an Scores Over Modern Science.

قرآن جدید سائنس پر بازی لے جاتا ہے۔

ڈاکٹر کیتھ مور (Keith Leon Moore, 1925-2019) جنینیات (Embryology) کے ماہر ہیں اور کناڈا کی ٹورانٹو یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔انہوں نے قرآن کی چند آیات (23:14 ، 39:6)اور جدید سائنسی تحقیقات کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔اس سلسلے میں وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کئی بار کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی (جدہ) بھی گئے۔انہوں نے پایا کہ قرآن کا بیان حیرت انگیز طور پر جدید دریافتوں کے عین مطابق ہے۔یہ دیکھ کرانھیں سخت تعجب ہوا کہ قرآن میں کیوں کر وہ حقیقتیں موجود ہیں جن کو مغربی دنیانے پہلی بار صرف 1940ء میں معلوم کیا۔اس سلسلے میں انہوں نے ایک مقالہ لکھا ہے جس میں وہ مذکورہ واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> The 1300-year-old Koran contains passages so accurate about embryonic development that Muslims can reasonably believe them to be revelations from God.

> 13سو سالہ قدیم قرآن میں جنینی ارتقاء کے بارے میں اس قدر درست بیانات موجود ہیں کہ مسلمان معقول طور پر یہ یقین کر سکتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے اتاری ہوئی آیتیں ہیں۔

یہ مضمون زیادہ مفصل طور پر ماہنامہ الرسالہ (دسمبر 1985) میں "قرآن اور سائنس" کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے۔

نیوٹن کا نظریہ نور

انسان جب بھی کسی مسئلہ پر کلام کرتا ہے تو فوراً ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ حال میں بول رہا ہے۔ اسے مستقبل کی کوئی خبر نہیں۔ کوئی انسان آئندہ ظاہر ہونے والی حقیقتوں کو نہیں جانتا اس لیے وہ اپنے کلام میں ان کی رعایت بھی نہیں کر سکتا۔ یہ ایسا معیار ہے جس پر آدمی ہمیشہ ناکام ثابت ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، قرآن کو دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا مصنف ایک ایسی ہستی ہے جس کی نظر ماضی سے مستقبل تک یکساں طور پر پھیلی ہوئی ہے۔ وہ آج کے معلوم واقعات کو بھی جانتا ہے اور ان واقعات کو بھی جو کل انسان کے علم میں آئیں گے۔

مثال کے طور پر نیوٹن (1642-1727) نے روشنی کے بارے میں نظریہ قائم کیا کہ یہ چھوٹے چھوٹے روشن ذرات ہیں جو اپنے منبع سے نکل کر فضا میں اڑتے ہیں۔ اس نظریہ کو سائنس کی تاریخ میں روشنی کا ذراتی نظریہ (Corpuscular theory of light) کہا جاتا ہے:

> A theory of Optics, in which light is treated as a stream of particles.

نیوٹن کے غیر معمولی اثرات کے تحت یہ نظریہ 1820 تک علمی دنیا پر چھایا رہا۔ اس کے بعد اس کو زوال شروع ہوا۔ مختلف سائنس دانوں کی تحقیقات، خاص طور پر فوٹان (Photons) کے عمل کی دریافت نے روشنی کے ذراتی نظریہ کو ختم کر دیا۔ پروفیسر ینگ (اور دوسرے سائنس دانوں) کی تحقیق نے علماء کو مطمئن کر دیا کہ روشنی بنیادی طور پر

موج کی سی خصوصیات رکھتی ہے جو بظاہر نیوٹن کے ذراتی نظریہ کے برعکس ہے:

Young's work convinced scientists that light has essential wave characteristics in apparent contradiction to Newton's corpuscular (particle) theory (*Encyclopaedia Britanica*, 1984, Vol. 19, p. 665)

نیوٹن نے اٹھارھویں صدی عیسوی میں اپنا نظریہ پیش کیا اور صرف دو سو سال کے اندر وہ غلط ثابت ہو گیا۔ اس کے برعکس قرآن نے ساتویں صدی عیسوی میں اپنا پیغام دنیا کے سامنے رکھا۔ اور چودہ سو سال گزرنے کے باوجود اس کی صداقت آج تک مشتبہ نہیں ہوئی۔ کیا اس کے بعد بھی اس یقین کے لیے کسی مزید ثبوت کی ضرورت ہے کہ نیوٹن جیسے لوگوں کا کلام محدود انسانی کلام ہوتا ہے اور قرآن لا محدود ذہن سے نکلا ہوا خدائی کلام ہے۔ قرآن کے بیانات کا ابدی طور پر درست ثابت ہونا ایک انتہائی غیر معمولی صفت ہے جو کسی بھی دوسرے کلام کو حاصل نہیں۔ یہی واقعہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ قرآن خدائی کلام ہے اور بقیہ تمام کلام انسانی کلام۔

کائنات کا آغاز

قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا (21:30)۔ کیا منکروں نے نہیں دیکھا کہ آسمان و زمین ملے ہوئے تھے پھر ہم نے دونوں کو کھول دیا۔

"رتق" کے معنٰی ہیں منضم الا جزاء۔یعنی کسی چیز کے تمام اجزاء کاایک دوسرے میں گھسا ہوااور سمٹا ہوا ہونا۔اور فتق کا لفظ اس کے برعکس عمل کے لیے ہے۔یعنی ملے ہوئے اجزاء کو پھاڑ کر الگ الگ کر دینا۔

یہ آیت ساتویں صدی عیسوی میں اتری۔بظاہر اس سے معلوم ہوتا تھا کہ کائنات کے مختلف اجزاء ابتداءً باہم ملے ہوئے اور سمٹے ہوئے تھے۔اس کے بعد خدانے ان کو پھاڑ کر جدا کر دیا تاہم نزولِ قرآن کے بعد صدیوں تک انسان کو معلوم نہ تھا کہ کائنات میں وہ کون سا معاملہ پیش آیاہے جس کو قرآن نے رتق اور فتق سے تعبر کیاہے۔پہلی بار اس کی معنویت 1927 میں سامنے آئی جب کہ جارج لیماترے(Georges Lemaitre)نے وہ نظریہ پیش کیا جس کو عام طور پر بگ بینگ(Big Bang) کہا جاتاہے۔

جدید مشاہدہ بتاتاہے کہ کائنات ہر لمحہ اپنے چاروں طرف پھیل رہی ہے۔چنانچہ موجودہ کائنات کو پھیلتی ہوئی کائنات (expanding universe) کہا جاتاہے۔اس طرح کے مختلف مشاہدات نے سائنس دانوں کواس نظریہ تک پہنچایاہے کہ کائنات ابتداءً سمٹی ہوئی حالت میں تھی۔اس وقت وسیع کائنات کے تمام اجزاء نہایت قوت سے باہم جڑے ہوئے تھے۔اس ابتدائی مادہ کو کائناتی بیضہ (Cosmic egg) یا سپر ایٹم (Super atom) کہا جاتاہے۔

ابتداءً سائنسی حلقہ میں اس کی مخالفت کی گئی۔1948ء تک بگ بینگ کے مقابلے میں اسٹڈی اسٹیٹ نظریہ(Steady-state hypothesis)سائنس دانوں کے یہاں زیادہ قابل توجہ بنا رہا۔ 1950ء سے علم کا وزن بگ بینگ کے حق میں بڑھنے لگا۔

1965ء میں بیک گراؤنڈ ریڈئیشن (background radiation) کی دریافت نے اس کی مزید تصدیق کی، کیونکہ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ یہ ابتدائی انفجار کے ریڈیائی بقایا ہیں جو ابھی تک کائنات کے بعض حصوں میں موجود ہیں۔ اسی طرح 1981ء میں بعض کہکشاؤں کی دریافت جو ہماری زمین سے دس ارب سال نور (light years) کے فاصلے پر واقع ہیں، وغیرہ۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (1984ء) میں بگ بینگ کے عنوان کے تحت اعتراف کیا گیا ہے کہ "اور اب اس نظریہ کو بیشتر علماء کونیات کی تائید حاصل ہے":

And it is now favoured by most cosmologists.

یہ واقعہ اس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ قرآن کا مصنف ایک ایسی ہستی ہے جس کی نظر میں ماضی سے لے کر مستقبل تک کے تمام حقائق ہیں۔ وہ چیزوں کو وہاں سے دیکھ رہا ہے جہاں سے انسان نہیں دیکھ سکتا۔ وہ اس وقت بھی پوری طرح جان رہا ہوتا ہے جب کہ دوسروں کو کوئی علم نہیں ہوتا۔

شہد کی طبّی اہمیت

قرآن میں شہد کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اس کے اندر شفا ہے: فِيْهِ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ (17:69)۔ مسلمانوں نے اس آیت کی روشنی میں شہد کے طبّی پہلو پر بہت زور دیا۔ مسلمانوں کے یہاں دواسازی کے فن میں شہد کو خصوصی درجہ حاصل رہا ہے۔ مگر مغربی دنیا صدیوں تک اس کی طبّی اہمیت سے بے خبر رہی۔ یورپ میں ابھی انیسویں صدی تک شہد کو بس ایک رقیق غذا (liquid food) کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ صرف بیسویں صدی کی بات ہے کہ یورپ کے علماء نے یہ دریافت کیا کہ شہد کے اندر دافع

عفونت خصوصیات(antiseptic properties)موجود ہیں۔

اس سلسلے میں ہم جدید تحقیقات کا خلاصہ ایک امریکی میگزین سے نقل کرتے ہیں:

Honey is a powerful destroyer of germs which produce human diseases. It was not untill the twentieth century, however, that this was demonstrated scientifically. Dr. W. G. Sackett, formerly with the Colorado Agricultural College at Fort Collins, attempted to prove that honey was a carrier of disease much like milk. To his surprise, all the disease germs he introduced into pure honey were quickly destroyed. The germ that causes typhoid fever died in pure honey after 48 hours' exposure. Enteritidis, causing intestinal inflation, lived 48 hours. A hardly germ which causes broncho- pneumonia and septicemia held out for four days. Bacillus coli Communis which under certain conditions causes peritonitis, was dead on the fifth day of experiment. According to Dr. Bodog Beck, there are many other germs equally destructible in honey. The reason for this bactericidal quality in honey, he said, is in its hygroscopic ability. It literally draws every particle of moisture out of germs. Germs like any other living organism, perish without water. This power to absorb moisture is almost unlimited. Honey will draw moisture from metal, glass and even stone rocks.

(*Rosicrucian Digest*, September 1975 p.11)

شہد جراثیم کو مار ڈالنے والی چیز ہے جو کہ انسانی بیماریاں پیدا کرتے ہیں۔ تاہم بیسویں صدی سے پہلے تک اس کو علمی طور پر دکھایا نہیں جا سکا تھا۔ڈاکٹر ساکٹ جو اس سے پہلے فورٹ کولنس کے ایگر یکلچرل کالج سے وابستہ تھے، انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ شہد کے اندر بیماری کے جراثیم پرورش پاتے ہیں جس طرح وہ دودھ میں پرورش پاتے ہیں۔ مگر ان کو سخت تعجب ہوا جب تجربات کے دوران انہوں نے پایا کہ بیماری پیدا کرنے والے جراثیم جو انھوں نے خالص شہد کے اندر ڈالے تھے وہ سب کے سب بہت جلد مر گئے۔معیادی بخار (typhoid fever) کے جراثیم صرف 48 گھنٹہ کے اندر ہلاک ہو گئے۔ بعض سخت جاں جراثیم چار دن یا پانچ دن سے زیادہ زندہ نہ رہ سکے۔ڈاکٹر بوڈوگ بک نے بتایا ہے کہ شہد کے اندر جراثیم کو مارنے کی اس خصوصیت کی سادہ سی وجہ ہے ،وہ شہد کی رطوبت کو چوس لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔شہد جراثیم کی رطوبت کا ہر جزء کھینچ لیتی ہے۔جراثیم دوسرے حیوانات کی طرح پانی کے بغیر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ شہد کے اندر پانی جذب کرنے کی صلاحیت لامحدود مقدار میں ہے۔وہ دھات ، شیشہ اور پتھر تک سے رطوبت کھینچ لیتی ہے۔

عربی زبان تمام زبانوں کے درمیان ایک حیران کن استثناہے۔تاریخ بتاتی ہے کہ ایک زبان کی عمر پانچ سو سال سے زیادہ نہیں ہوتی۔ تقریباً پانچ سو سال میں ایک زبان اتنی زیادہ بدل جاتی ہے کہ اگلی نسل کے لوگوں کے لیے پچھلے لوگوں کا کلام سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جافرے چاسر (1342-1400)اور ولیم شیکسپیئر (1564-1616)انگریزی زبان کے شاعر اور ادیب تھے۔ مگر آج کا ایک عام انگریزی داں ان کو پڑھنا چاہے تو اس کو انہیں ترجمہ کر کے پڑھنا پڑے گا۔ چاسر اور شیکسپیئر کا کلام جدید انگریزی نصاب میں ترجمہ کر کے پڑھایا جاتا ہے۔ تقریباً ویسے ہی جیسے غیر زبان کی کتابیں ترجمہ کر کے پڑھائی جاتی ہیں۔

مگر عربی زبان کا معاملہ استثنائی طور پر اس سے مختلف ہے۔ عربی زبان پچھلے ڈیڑھ ہزار سال سے یکساں حالت پر باقی ہے۔اس کے الفاظ اور اسلوب میں یقیناً ارتقاء ہوا ہے۔ مگر یہ ارتقاء اس طرح ہوا ہے کہ الفاظ اپنے ابتدائی معنی کو بدستور باقی رکھے ہوئے ہیں۔ قدیم عرب کا کوئی شخص اگر آج دوبارہ زندہ ہو تو آج کے عربوں میں بھی وہ اسی طرح بولا اور سمجھا جائے گا۔ جس طرح چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی کے عرب میں وہ بولا اور سمجھا جاتا تھا۔

یہ سراسر قرآن کا معجزہ ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے عربی زبان کو پکڑ رکھا ہے،تا کہ جس طرح قرآن کو قیامت تک باقی رہنا ہے اسی طرح عربی زبان بھی زندہ اور قابل فہم حالت میں قیامت تک باقی رہے۔ یہ کتاب کبھی "کلاسیکل لٹریچر" کی الماری میں نہ جانے پائے وہ ہمیشہ لوگوں کے درمیان پڑھی اور سمجھی جاتی رہے۔

یہی معاملہ علوم کا بھی ہے۔ یہاں بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے علوم کو پکڑ

رکھا ہے۔ وہ علوم کو پکڑ کر بیٹھ گیا ہے تاکہ قرآن نے کسی معاملہ میں جو کچھ کہہ دیا ہے وہی ہمیشہ حرفِ آخر کی حیثیت سے باقی رہے۔ چنانچہ بے شمار علمی ترقیوں کے باوجود علوم بالآخر وہیں باقی رہتے ہیں یا وہیں لوٹ آتے ہیں جہاں قرآن نے اوّل دن اس کو رکھ دیا تھا۔

ایک طرف انسانی کلام کی مثال ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی اس معیار پر پورا نہیں اترتا۔ جب کہ قرآن انتہائی بڑے اور گہرے معاملات میں بھی اپنی برتر صداقت کو قائم کیے ہوئے ہے۔ یہاں میں ایک تقابلی مثال دوں گا۔

ارسطو نے اپنے تصوراتی معاشرہ میں عورت کو کم تر درجہ دیا ہے۔ اس کا ثبوت اس کے نزدیک یہ ہے کہ عورت کے منھ میں مرد سے کم دانت ہوتے ہیں۔ برٹرینڈ رسل نے اس کا مذاق اڑایا ہے۔ اس نے اپنی کتاب "سماج پر سائنس کے اثرات" میں ارسطو کا مذاق اڑاتے ہوئے لکھا ہے:

> Aristotle maintained that women have fewer teeth than men; although he was twice married, it never occured to him to verify this statement by examining his wive's mouths. (*The Impact of Science on Society*, 1953, p. 7)

> ارسطو نے دعویٰ کیا کہ عورتوں کے یہاں مردوں سے کم دانت ہوتے ہیں۔ اگرچہ ارسطو کی دو بار شادی ہوئی تھی مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ وہ اپنی بیویوں کے منہ کو جانچ کر اس بیان کی تصدیق کرتا۔

ارسطو کا بیان حقیقت واقعہ پر حاوی نہ ہو سکا۔ اس کے برعکس، قرآن کے بیانات حقیقت واقعہ کا اس طرح احاطہ کیے ہوئے ہیں کہ دونوں کبھی ایک دوسرے کے خلاف

نہیں جاتے۔

یہاں میں ایک مثال دوں گا۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ خدا اس کائنات کا حاکم مطلق ہے۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق جس طرح چاہتا ہے اسے چلاتا ہے:

فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْد (85:16)۔ کر ڈالنے والا جو چاہے۔

يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ (14:27)۔ اور اللہ کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔

پچھلے ہزاروں سال سے خدا کا یہ تصور تسلیم شدہ چلا آرہا تھا۔ انسان اس کو بلا بحث مانے ہوئے تھا۔

مگر موجودہ زمانے میں علم کی ترقی ہوئی تو انسان نے یہ نظریہ قائم کر لیا کہ واقعات کے پیچھے معلوم مادی اسباب کے سوا اور کوئی طاقت نہیں۔ تمام واقعات مادی اسباب و علل کے تحت وقوع میں آتے ہیں۔ اور مادی قوانین کے تحت ان کی کامل توجیہ کی جا سکتی ہے۔ مگر بعد کی علمی تحقیقات نے اس مفروضے کو ڈھا دیا۔ اب علم دوبارہ وہیں آ گیا جہاں وہ ابتدا میں ٹھہرا ہوا تھا۔

اصول تعلیل کی موت

کہا جاتا ہے کہ نیوٹن (1642-1727) اپنے باغ میں تھا۔ اس نے سیب کے ایک درخت سے سیب کا پھل گرتے ہوئے دیکھا۔ سیب کا پھل شاخ سے الگ ہو کر نیچے کیوں گرا۔ وہ اوپر کیوں نہیں چلا گیا۔ اس نے سوچا، اس سوال نے آخر کار اس کو یہاں تک پہنچایا کہ زمین میں قوتِ کشش ہے۔ وہ ہر چیز کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پھل

درخت سے ٹوٹ کر زمین پر گرتا ہے، وہ اوپر کی طرف نہیں جاتا۔

مگر یہ آدھی حقیقت تھی۔ نیوٹن کو سوچنا چاہیے تھا کہ درخت کا پھل اگر اوپر سے نیچے گرتا ہے تو اسی درخت کا تنہ نیچے سے اوپر کی طرف کیوں جاتا ہے۔ ایک ہی درخت ہے۔ اس کی جڑیں زمین کے نیچے کی طرف جارہی ہیں۔ اس کا پھل ٹوٹتا ہے تو وہ گر کر نیچے آجاتا ہے۔ مگر اسی درخت کا تنہ اور اس کی شاخیں زمین سے اُٹھ کر اوپر کی طرف چلی جارہی ہیں۔

درخت کا یہ دوگونہ پہلو نیوٹن کے مفروضہ کی نفی کر رہا تھا۔ تاہم اس نے معاملہ کے ایک پہلو کو چھوڑ کر اس کے دوسرے پہلو کو لے لیا۔ پھر اسی کی روشنی میں اس نے خلا میں پھیلے ہوئے شمسی نظام کے اصول مرتب کیے۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ تمام اجرام میں ایک خاص تناسب سے قوتِ کشش موجود ہوتی ہے۔ یہی کشش سورج اور اس کے گرد گھومنے والے سیاروں کو سنبھالے ہوئے ہے اور اس کو نہایت صحت کے ساتھ متحرک رکھتی ہے۔

یہ طرزِ فکر مزید آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ آئن سٹائن (1879-1955) نے اپنے نظریہ اضافیت کے تحت اس کو مزید موکّد کیا۔ آئن سٹائن کی تحقیق اگرچہ نیوٹن کے تمام نظریات کی تصدیق نہیں کرتی۔ تاہم نظامِ شمسی کے سلسلے میں اس کے نظریہ کی بنیاد کشش ثقل کے اصول پر ہی قائم ہے۔

Einstein's theory of relativity declares that gravity controls the behaviour of planets, stars, galaxies and the universe itself and does it in a predictable manner.

آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت کہتا ہے کہ کشش ثقل سیاروں، ستاروں ،

کہکشاؤں اور خود کائنات کے عمل کو کنڑول کرتی ہے۔ یہ عمل اس طرح ہوتا ہے کہ اس کی پیشین گوئی کی جاسکتی ہے۔

اس سائنسی دریافت کو ہیوم (1711-1776) اور دوسرے مفکرین نے فلسفہ بنایا۔ انہوں نے کہا کہ کائنات کا سارا نظام اصول تعلیل (Principle of Causation) پر چل رہا ہے۔ جب تک اسباب و علل کی کڑیاں معلوم نہیں تھیں انسان یہ سمجھتا رہا کہ کائنات کو کنڑول کرنے والا ایک خدا ہے۔ مگر اب ہم کو اسباب و علل کے قوانین کا علم ہو گیا ہے۔ اب ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ تعلیل (Causation) کا مادی اصول کائنات کو متحرک کرنے والا ہے، نہ کہ کوئی مفروضہ خدا۔

مگر بعد کی تحقیقات نے اس مفروضے کا خاتمہ کر دیا۔ بعد کو ڈیراک، ہیزن برگ اور دوسرے سائنس دانوں نے ایٹم کے ڈھانچہ کا مطالعہ کیا۔ انہوں نے پایا کہ ایٹم کا نظام اس اصول کی تردید کر رہا ہے جو شمسی نظام کے مطالعہ کی بنیاد پر اختیار کیا گیا تھا۔

اس دوسرے نظریہ کو کوانٹم نظریہ کہا جاتا ہے اور وہ مذکورہ اصول تعلیل کی کامل تردید ہے:

> The quantum mechanics theory maintains that at the atomic level, matter behaves randomly.

کوانٹم میکینکس کا نظریہ کہتا ہے کہ ایٹم کی سطح پر مادہ غیر مرتب انداز میں عمل کرتا ہے۔

سائنس میں کسی "اصول" کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ سارے عالم میں یکساں طور پر کام

کرتا ہو۔ اگر ایک معاملہ بھی ایسا ہو جس پر وہ اصول چسپاں نہ ہوتا ہو تو علمی طور پر اس کا مسلّمہ اصول ہونا مشتبہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب یہ معلوم ہوا کہ ایٹم کی سطح پر مادہ اس طرح عمل نہیں کرتا جس کا مشاہدہ نظامِ شمسی کی سطح پر کیا گیا تھا تو تعلیل بحیثیت سائنسی اصول کے رد ہو گیا۔

آئن سٹائن کو یہ بات نا قابلِ فہم معلوم ہوئی۔ کیونکہ اس طرح کائنات مادی کرشمے کے بجائے ارادی کرشمہ قرار پا رہی تھی۔ اس نے اس مسئلہ پر باقاعدہ تحقیق شروع کی۔ اپنی زندگی کے آخری 30 سال اس نے اس کوشش میں صرف کر دیے کہ نظام فطرت میں اس تضاد کو ختم کرے۔ شمسی نظام اور ایٹمی نظام دونوں کے عمل کو ایک قانون کے تحت منظّم کر سکے۔ مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ بالآخر ناکام مر گیا۔

Einstein spent the last 30 years of his life trying to reconcile these seeming contradictions of nature. He rejected the randomness of quantum mechanics. "I cannot believe that God plays dice with the cosmos", he said.

آئن سٹائن نے اپنی آخری زندگی کے 30 سال اس پر صرف کیے کہ فطرت کے اس بظاہر متضاد اصول کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرے۔ اس نے کوانٹم نظریہ کی بے ترتیبی کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ میں یقین نہیں کر سکتا کہ خدا کائنات کے ساتھ جوا کھیل رہا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا بیان کائنات کو پکڑے ہوئے ہے۔ شمسی نظام کی سطح پر حرکت کا مطالعہ کر کے انسان نے اٹھارویں اور انیسویں صدی میں یہ رائے قائم کر لی کہ

اس کی حرکت معلوم مادی اسباب کے تحت ہو رہی ہے۔ یہ بااختیار خدا کے قرآنی تصور کی گویا تردید تھی مگر علم کا دریا جب آگے بڑھا تو دوبارہ قرآن والی بات غالب آگئی۔ بیسویں صدی میں ایٹمی نظام کے مطالعہ نے بتایا کہ ایٹم کی سطح پر اس کے ذرات کی حرکت کا کوئی معلوم قاعدہ نہیں۔

ایک سائنس دان اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے:

The laws of physics discovered on earth contain arbitrary numbers,like the ratio of the mass of an electron to the mass of a proton, which is roughly 1840 to one. Why? Did a creator arbitrarily choose these numbers? (lan Roxburg).

طبیعات کے قوانین جو زمین پر دریافت کیے گئے ہیں وہ تحکمی گنتیوں پر مشتمل ہیں، جیسے الیکٹران کی مقدار مادہ کا تناسب ایک پروٹان کے مقدار مادہ سے جو کہ تقریباً 1840 کے مقابلے میں ایک ہوتا ہے۔ کیوں۔ کیا ایک خالق نے تحکمی طور پر انہیں گنتیوں کا انتخاب کر رکھا ہے۔ (سنڈے ٹائمس، لندن، 4 دسمبر 1977)

یہ الفاظ سائنس دان کی زبان سے اس بات کا اعتراف ہیں کہ کائنات انسانی علم کے احاطہ میں نہیں آتی۔ کائنات ایک قادر مطلق خدا کی مرضی کا ظہور ہے۔ اور خدا کی مرضی کے تصور کے تحت ہی اس کی واقعی توجیہ کی جاسکتی ہے۔[1]

[1] یہ مقالہ قرآنی سیمینار (لاہور) میں 26 مارچ 1985 کو پڑھ کر سنایا گیا۔

قرآن خدا کی آواز

کائنات ایک راز ہے اور جو کتاب اس راز کو کھولتی ہے، وہ قرآن ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کتابِ الٰہی کے بغیر کوئی شخص حیات و کائنات کے معّمے کو حل نہیں کر سکتا۔ میں نے حال میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ مارکسزم کا مطالعہ کیا ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ مارکس غیر معمولی دل و دماغ کا آدمی تھا ایسا کہ اس جیسی صلاحیت کے بہت کم انسان تاریخ میں پیدا ہوئے ہیں۔ مگر اس نے ایسی احمقانہ باتیں کہیں ہیں کہ تاریخ میں اس کے جیسی احمقانہ باتیں بہت کم لوگوں نے کی ہوں گی۔ اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس نے قرآن کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ اس کو علم کا وہ سرا نہیں ملا تھا جس کے بغیر زندگی کے معاملات میں کوئی صحیح اور قطعی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔

ایک دوا جو کسی کارخانے سے بن کر نکلتی ہے۔ اس کے ساتھ اس کی ترکیبِ استعمال کا پُرزہ بھی رکھ دیا جاتا ہے، جس میں لکھا ہوا ہوتا ہے کہ یہ دوا کس مرض کے لیے ہے، کن اجزاء سے مل کر بنی ہے اور کس طرح اسے استعمال کرنا چاہیے۔ مگر آدمی اس حال میں پیدا ہوتا ہے کہ اسے کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کیا ہے اور کس طرح اسے دنیا میں لا کر ڈال دیا گیا ہے۔ وہ اپنے ساتھ کوئی صحیفہ لے کر نہیں آتا اور نہ کسی پہاڑ کی چوٹی پر ایسا کوئی بورڈ لگا ہوا ہے جہاں ان سوالات کا جواب لکھ کر رکھ دیا گیا ہو۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اصل حقیقت سے بے خبر ہو کر اپنے اور زمین و آسمان کے بارے میں عجیب عجیب رائے قائم کرنے لگتا ہے، وہ اپنے وجود پر غور کرتا ہے تو وہ اسے ذہنی اور جسمانی قوتوں کا ایک

حیرت انگیز مجموعہ نظر آتا ہے، جس کے بنانے میں اس کے اپنے ارادہ عمل کا کوئی دخل نہیں ہوتا ہے۔ پھر اپنے وجود سے باہر کی دنیا پر نظر کرتا ہے تو اسے ایک نہایت وسیع پھیلی ہوئی کائنات ملتی ہے۔ جس کا وہ احاطہ نہیں کر سکتا۔ جس کو وہ پار نہیں کر سکتا۔ جس کے اندر چھپے ہوئے خزانوں کو وہ شمار نہیں کر سکتا۔ یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے؟ یہ دنیا کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں جا کر ختم ہو گی؟ اس تمام ہست و بود کا مقصد کیا ہے؟ وہ اپنے آپ کو ان چیزوں کے بارے میں بالکل ناواقف پاتا ہے۔ انسان کو آنکھ دی گئی ہے لیکن وہ آنکھ ایسی ہے جو کسی چیز کے صرف ظاہر کو دیکھ سکتی ہے۔ اس کے پاس عقل ہے مگر عقل کی بے بسی کا یہ عالم ہے کہ اسے خود اپنی خبر نہیں۔ آج تک انسان یہ معلوم نہ کر سکا کہ ذہنِ انسانی میں خیالات کیوں کر پیدا ہوتے ہیں اور وہ کس طرح سوچتا ہے۔ ایسی حقیر صلاحیتوں کے ساتھ وہ نہ تو اپنے بارے میں کسی صحیح نتیجہ تک پہنچ سکتا ہے اور نہ کائنات کو سمجھ سکتا ہے۔

اس معمّے کو خدا کی کتاب حل کرتی ہے۔ اس آسمان کے نیچے آج قرآن ہی ایک ایسا صحیفہ ہے جو پورے یقین کے ساتھ تمام حقیقتوں کے بارے میں ہم کو قطعی علم بخشتا ہے۔ جن لوگوں نے کتابِ الٰہی کے بغیر کائنات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے ان کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے اندھوں کے پاس ایک ہاتھی کھڑا کر دیا جائے اور پھر ان سے پوچھا جائے کہ ہاتھی کیسا ہوتا ہے، تو جس کا ہاتھ اس کی دُم پر پڑے گا وہ کہے گا کہ ہاتھی ایسا ہوتا ہے جیسے مور چھل، کوئی کان ٹٹول کر کہے گا کہ ہاتھی ایسا ہوتا ہے جیسے سوپ(Soop)، کوئی پیٹھ پر ہاتھ پھیرے گا اور کہے گا کہ ہاتھی ایسا ہوتا ہے جیسے تخت، کوئی پاؤں چھو کر کہے گا کہ ہاتھی

ایسا ہوتا ہے جیسے کھمبا۔ تمام بے خدا فلسفیوں اور مفکروں کا یہی حال ہے۔ انہوں نے کائنات کے اندر حقیقت کو ٹٹولنے کی کوشش کی مگر علم کی روشنی سے چونکہ وہ محروم تھے۔ اس لیے ان کی تمام کوششوں کا ماحصل اس کے سوا کچھ نہ نکلا جیسے کوئی شخص اندھیرے میں بھٹک رہا ہو اور اٹکل کے ذریعے الٹے سیدھے فیصلے کرتا رہے۔

دنیا میں ایسے لوگ گزرے ہیں جو ساری زندگی حقیقت کی تلاش میں رہے۔ مگر حقیقت کو نہ پا کر خودکشی کرلی، اور بہت سے لوگ ایسے بھی ہوئے ہیں جن کو حقیقت تو نہ ملی۔ مگر صرف اٹکل سے انہوں نے ایک فلسفہ گھڑ لیا۔ میرے نزدیک ان دو قسم کے انسانوں میں صرف اتنا ہی فرق ہے کہ ایک نے اپنی اٹکل کو عقل سمجھا اور اس کو مرتّب کر کے دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ اور دوسرے کو اپنی اٹکل پر اطمینان نہیں ہوا۔ اور اس نے عاجز آ کر اس حیرت کدہ عالم سے نکل جانے کی کوشش کی اور خود اپنا گلا گھونٹ ڈالا حقیقی علم سے یہ بھی محروم تھے اور وہ بھی۔ رازِ حیات کا جو اصل رازداں ہے اس کی مدد کے بغیر کوئی شخص اس راز کو نہیں سمجھ سکتا، یقیناً انسان کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی گئی ہے مگر اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے آنکھ۔ یقیناً اس میں دیکھنے کی صلاحیت ہے، مگر کیا خارجی روشنی کے بغیر کوئی آنکھ دیکھ سکتی ہے؟ رات کے وقت ایک اندھیرے کمرے میں آنکھ رکھتے ہوئے بھی آپ کو کچھ سجھائی نہیں دیتا مگر جب بجلی کا بلب روشن کر دیا جائے تو ہر چیز صاف نظر آنے لگتی ہے۔ اسی طرح وحیِ الٰہی عقل کی روشنی ہے۔ اس روشنی کے بغیر ہم اشیاء کی حقیقت کو نہیں پا سکتے۔

ایک صاحب سے ایک مرتبہ میری گفتگو ہوئی۔ انہوں نے کہا، یہ بات کہی جاتی ہے کہ علم اس کا نام نہیں ہے کہ آدمی بہت سی کتابیں پڑھے ہوئے ہو اور مدرسوں اور کالجوں

کی ڈگری اپنے پاس رکھتا ہو۔سب سے بڑا علم ایمان ہے۔قرآن میں بھی آیا ہے کہ خدا سے ڈرنے والے لوگ ہی حقیقت میں عالم ہیں۔مگر یہ بات ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی، میں نے کہا کارل مارکس جسے معاش کا پیغمبر کہا جاتا ہے،اس کو لیجئے،اس کو وہ علم حاصل نہیں تھا جو خدا کے فضل سے آج آپ کو حاصل ہے۔اس کے سامنے دنیا کی یہ صورتِ حال آئی کہ کچھ لوگ جاگیر دار اور کارخانہ دار بن کر دولت کے بڑے حصہ پر قابض ہو گئے ہیں اور بیشتر لوگ نہایت مفلسی کی حالت میں زندگی گزار رہے ہیں۔اس نے کہا کہ اس اونچ نیچ کی اصل جڑ موجودہ ملکیتی نظام ہے جس میں چیزیں استعمال کے لیے نہیں بنتیں، بلکہ اس لیے تیار کی جاتی ہیں کہ دوسرے انسانوں کے ہاتھ بیچ کر ان سے نفع کمایا جائے۔اس کی وجہ سے افراد کو موقع ملتا ہے کہ اپنی ملکیت بڑھانے اور زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کے لیے دوسروں کو لوٹیں۔اس کا علاج اس نے یہ تجویز کیا کہ ملکیت کے حقوق سرے سے ختم کرکے دولت حاصل کرنے کے ذرائع کو عوام کے مشترکہ قبضے میں دے دیا جائے اور حکومت کے ذمہ یہ کام سپرد کیا جائے کہ وہ سب کے مفاد کے مطابق دولت کی پیدائش اور تقسیم کا اجتماعی انتظام کرے۔

سوال یہ ہوا کہ ایسی صورت میں تمام چیزوں پر حکومت کا قبضہ ہو جائے گا۔اور جب آج کچھ لوگ سرمایہ دار بننے کے ذرائع اپنے ہاتھ میں پاکر نفع اندوزی میں مبتلا ہو گئے ہیں تو دوسرے کچھ لوگ جن کے سپرد خزانہ کیا جائے گا کیا وہ بھی ایسا ہی نہیں کریں گے، جب کہ دولت حاصل کرنے ذرائع کے ساتھ ان نئے منتظمین کو فوج اور قانون سازی کی طاقتیں بھی حاصل ہوں گی۔کارل مارکس نے جواب دیا کہ "حرص اور لوٹ اصل میں

ملکیتی نظام کی پیداوار ہے۔اشتراکی سماج میں اس قسم کی چیزیں ختم ہو جائیں گی"۔میں نے صاحب موصوف سے پوچھااب آپ بتائیے کہ کارل مارکس کا یہ خیال صحیح تھا؟انہوں نے کہاہر گز نہیں آخرت کی بازپرس کے سوادنیا میں کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے جو آدمی کو ظلم اور خود غرضی سے پاک کر سکے۔میں نے کہا پھر علم والا کون ہوا،آپ یا کارل مارکس؟ جس کے خود ساختہ نظریہ کا نتیجہ یہ ہے کہ انسانیت پہلے سے بھی زیادہ ظلم و ستم کا شکار ہو رہی ہے۔کیونکہ زار اور سرمایہ دار پہلے دو الگ الگ وجود تھے اور اب اشتراکی نظام میں جو زار ہے وہی سرمایہ دار بھی ہے۔

تقریباًیہی کیفیت ان تمام فلسفیوں کی ہے جنہوں نے خدا کے بغیر کائنات کا معمّا حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کے خیالات دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اتنے بڑے بڑے لوگ کیسی بچوں سی باتیں کرتے ہیں۔گویا اندھوں کے مجمع میں ایک ہاتھی ہے جس کو کوئی مور چھل بتاتا ہے،کوئی سوپ(Soop)،کوئی تخت کہتا ہے اور کوئی کھمبا۔اگر کتابِ الٰہی کی روشنی میں زندگی اور کائنات کا مطالعہ کیا جائے تو ہر چیز بالکل صاف صاف اپنی اصل شکل میں نظر آنے لگتی ہے اور ایک معمولی آدمی کو بھی اشیاء کی حقیقت سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی وہ پہلی نظر میں اصل حقیقت تک پہنچ جاتا ہے،مگر جو اس علم سے محروم ہے اس کے لیے یہ دنیا ایک بھول بھلیاں ہے جس میں وہ بھٹک رہا ہے۔

انسانی علوم ہم کو بہت کچھ دیتے ہیں۔مگر زیادہ سے زیادہ ان کے ذریعہ جو کچھ معلوم ہوتا ہے،وہ صرف یہ ہے کہ "کائنات کیا ہے"۔مگر اس کے بارے میں وہ اب تک ایک حرف نہ بتا سکے کہ "جو کچھ ہے وہ کیوں ہے"۔چند گیسیں،چند دھاتیں اور چند نمکیات کے

ملنے سے ایک چلتا پھرتا باشعور انسان وجود میں آتا ہے، مٹی میں بیج ڈال دینے سے ہرے بھرے پھل دار درخت اور پودے نکلتے ہیں۔

محض ایٹم کی تعداد بدل جانے سے بے شمار عناصر بن جاتے ہیں۔دو گیسوں کے ملنے سے پانی جیسی قیمتی چیز تیار ہو جاتی ہے۔پانی کے لیے سالمات کی حرکت (Molecular Motion)سے بھاپ کی طاقت پیدا ہوتی ہے جو دیو پیکر انجنوں کو حرکت دیتی ہے۔ایٹم کے حقیر برقیے جو کسی خوردبین کے ذریعہ دیکھے نہیں جا سکتے،ان کے انتشار سے وہ بے پناہ طاقت پیدا ہوتی ہے جو پہاڑوں کو توڑ ڈالتی ہے۔"یہ سب ہوتا ہے" بس ہم ان چیزوں کے بارے میں اسی قدر جانتے ہیں۔مگر "یہ سب کیوں ہو رہا ہے"،ان کے بارے میں انسانی علوم ہماری کوئی رہنمائی نہیں کرتے۔

> "دنیا کے تمام سمندروں کے کنارے ریت کے جتنے ذرّے ہیں۔شاید اسی قدر آسمان میں ستاروں کی تعداد ہے،ان میں کچھ ایسے ستارے ہیں جو زمین سے کسی قدر بڑے ہیں،مگر بیشتر ستارے اس قدر بڑے ہیں کہ ان کے اندر لاکھوں زمینیں رکھی جا سکتی ہیں، اور پھر بھی جگہ بچ رہے گی۔اور بعض ستارے تو اتنے بڑے ہیں کہ ان کے اندر اربوں زمینیں سما سکتی ہیں۔یہ کائنات اس قدر وسیع ہے کہ روشنی کی مانند ایک انتہائی تیز اڑنے والا ہوائی جہاز جس کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہو، وہ کائنات کے گرد گھومے تو اس ہوائی جہاز کو کائنات کا پورا چکّر لگانے میں تقریباً ایک ارب سال لگیں گے۔پھر یہ کائنات ٹھہری ہوئی نہیں ہے،بلکہ

ہر لمحہ اپنے چاروں طرف پھیل رہی ہے۔اس پھیلنے کی رفتار اتنی تیز ہے کہ 130 کروڑ سال کے بعد کائنات کے تمام فاصلے دگنے ہو جاتے ہیں۔اس طرح ہمارا یہ خیالی قسم کا غیر معمولی تیز رفتار ہوائی جہاز بھی کائنات کا چکّر کبھی پورا نہیں کر سکتا۔وہ ہمیشہ اس بڑھتی ہوئی کائنات کے راستہ میں رہے گا"۔[2]

انسانی مطالعہ ہم کو ایک حیرت انگیز کائنات کے سامنے لا کر چھوڑ دیتا ہے،وہ ہم کو نہیں بتاتا کہ اس کی حقیقت کیا ہے، کون ان واقعات کو وجود میں لا رہا ہے،اور وہ کون سا ہاتھ ہے جو خلائے بسیط میں عظیم الشان کُروں کو سنبھالے ہوئے ہیں۔یہ تمام باتیں ہم کو قرآن سے ملتی ہیں۔قرآن ہم کو بتاتا ہے کہ اشیاء کیوں کر وجود میں آئی ہیں،وہ کس طرح قائم ہیں اور مستقبل میں ان کا انجام کیا ہو گا۔وہ کائنات کے خالق اور مالک کا ہم سے تعارف کراتا ہے،اور اس کی کار فرمائیوں کو ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیتا ہے۔

قرآن سلطنتِ الٰہی کا لفظی مشاہدہ ہے۔ایک چھپا ہوا طاقتور ارادہ جو اس کائنات میں ہر طرف کام کر رہا ہے، قرآن کے صفحات میں وہ ہم کو بالکل محسوس طور پر نظر آتا ہے،وہ مابعد الطبیعی حقیقتیں جن کو آدمی سر کی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا اور نہ ہاتھوں سے چھو کر معلوم کر سکتا ہے، یہ کتاب ان کے بارے میں ہمیں قطعی خبر دیتی ہے۔اور صرف خبر نہیں دیتی بلکہ لفظوں کے ذریعے اتنے حیرت انگیز طریقہ پر ان کا مرقعہ (illustration) کھینچتی ہے کہ غیب بالکل شہود معلوم ہونے لگتا ہے۔یہ کتاب ہم کو صرف یہی نہیں بتاتی کہ "خدا

---

[2] یہ کائنات کی وسعت کے بارے میں آئن سٹائن کا نظریہ ہے مگر یہ صرف ایک "ریاضی داں کا قیاس" ہے، حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک انسان کائنات کی وسعت کو سمجھ نہیں سکا ہے۔

ہے"۔ بلکہ وہ حیرت انگیز طور پر ایک مدبّر کائنات کا زندہ تصور سامنے لا کر رکھ دیتی ہے کہ آنے والا دن بالکل نگاہوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔ مشہور ہے کہ یونان میں ایک مصوّر نے انگور کے خوشہ کی تصویر بنائی۔ یہ تصویر اتنی کامیاب تھی کہ چڑیاں اس پر چونچ مارتی تھیں، یہ ایک انسان کا آرٹ تھا۔ پھر قرآن تو خالقِ کائنات کا آرٹ ہے اس کے کمالِ فن کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔

قرآن مجید کا پہلا فقرہ ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (1:1)۔ یہ فقرہ نہایت بامعنٰی ہے۔ اس کے معنی ہیں "شکر ہے اس خدا کا جو تمام دنیا والوں کا مالک و مربی ہے"۔ مالک و مربی اس کو کہتے ہیں جو اپنے ماتحتوں پر گہری نظر رکھے، اور ان کی تمام ضروریات کا سامان فراہم کرے۔ انسان کی ضرورتوں میں سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اس کو بتایا جائے کہ وہ کیا ہے، کہاں سے آیا اور کہاں جائے گا، اس کا فائدہ کس چیز میں ہے اور نقصان کس چیز میں ہے۔ آدمی کو اگر کسی ایسے آسمانی کرّہ میں لے جا کر ڈال دیا جائے جہاں ہوا اور پانی کا وجود نہ ہو تو یہ اس کے لیے اتنا بڑا حادثہ نہ ہو گا جتنا بڑا حادثہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں اپنے آپ کو اس حال میں پائے کہ اپنے اور ماحول کے بارے میں وہ صحیح علم سے بے خبر ہے۔

اللہ اپنی مخلوق پر اس سے زیادہ مہربان ہے جتنا باپ اپنے بیٹے کے لیے ہوتا ہے۔ یہ ناممکن تھا کہ وہ اپنے بندوں کی اس محتاجی کو دیکھتا اور اسے پورا نہ کرتا۔ چنانچہ اس نے وحی کے ذریعے وہ ضروری علم بھیجا جو انسان کو اپنی معرفت حاصل کرنے کے لیے درکار تھا، اور ایک انسانی زبان جس کی متحمل ہو سکتی تھی۔ یہ خالق کا اپنے بندوں پر سب سے بڑا احسان ہے، جو بندہ اپنی حیثیت کو پہچانتا ہو اور جس کو یہ احساس ہو کہ وہ حقیقت کا علم جاننے کے

لیے اپنے خالق کا کس قدر محتاج ہے، اس کا دل خدا کی اس عنایت کو دیکھ کر شکر و سپاس کے جذبے سے لبریز ہو جائے گا اور اس کتاب کو پا کر وہ بے اختیار کہہ اٹھے گا، الحمد للہ رب العالمین۔ یہ بندے کی زبان سے ادا ہونے والا کلمہ ہے جو خدا کی طرف سے القا کیا گیا ہے۔ بندہ یہ جاننے کے لیے بھی کہ وہ کس طرح اپنے آقا کی بندگی کرے، آقا کی رہ نمائی کا محتاج ہے، آدمی کے اندر فطری طور پر بندگی کے جذبات امنڈتے ہیں مگر وہ نہیں جانتا کہ ان جذبات کو کس طرح ظاہر کرے۔ قرآن انہیں متعین کرتا ہے اور ان کے لیے الفاظ مہیّا کرتا ہے۔ قرآن کی دعائیں اس سلسلے میں بہترین عطیہ ہیں۔

قرآن معروف معنوں میں کوئی کتاب نہیں، زیادہ صحیح معنوں میں وہ دعوتِ اسلامی کی آخری جدوجہد کی سرگزشت ہے۔ اللہ تعالیٰ قدیم ترین زمانے سے انسانوں کے لیے حقیقت کا علم اپنے خاص بندوں کے ذریعہ بھیجتا رہا ہے۔ ساتویں صدی عیسوی میں اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہوئی کہ روئے زمین پر بسنے والوں کے لیے آخری طور پر حقیقت کا علم دے دے۔ اور اس علم کی بنیاد پر ایک باقاعدہ سوسائٹی کی تعمیر بھی کر دے تاکہ وہ قیامت تک تمام نسلِ انسانی کے لیے روشنی اور نمونہ کا کام دے سکے۔

اسی مقصد کے تحت اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب میں مبعوث فرمایا اور آپ کے ذمہ یہ خدمت سپرد کی کہ آپ عرب میں اس پیغام حق کی اشاعت کریں اور پھر جو لوگ آپ کے اس پیغام سے متاثر ہوں ان کے ذمہ یہ کام سپرد ہوا کہ وہ تمام دنیا میں اس پیغام کو پھیلائیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس علم حق کو پھیلانے اور اس کی بنیاد پر ایک انسانی معاشرہ قائم کرنے کی جو تحریک عرب میں پھیلائی

اس کو ہدایت دینے والا خود اللہ تعالیٰ تھا۔ اس نے اپنے براہِ راست کلام کے ذریعے پیغمبر پر وحی کہ اسے کن چیزوں کی تبلیغ کرنی ہے۔ اس نے وہ تمام دلائل فراہم کیے جو اس پیغام کو موثر بنانے کے لیے ضروری تھے۔ جب مخالفین کی طرف سے کوئی اعتراض اٹھا تو اس نے جواب دیا۔ جب اس دعوت کو قبول کرنے والوں میں کسی قسم کی کمزوری پیدا ہوئی تو اس نے فوراً اس کی اصلاح کی۔

اس نے جنگ و صلح کے احکام دیے اور تعلیم و تربیت کے قاعدے بتائے۔ اس نے شدائد کے وقت اپنے پیرؤوں کو تسلّی دی اور غلبہ کے وقت وہ قانونی احکام دیے جن کی بنیاد پر نئے معاشرہ کی تعمیر کرنی تھی۔ غرض یہ تحریک جس کی ابتداء اور انتہاء کے درمیان 23 سال کا فاصلہ ہے، اس کے تمام مراحل میں اللہ تعالیٰ ایک کلّی رہنما کی حیثیت سے ہدایات و احکامات بھیجتا رہا، یہی احکامات و ہدایات بعد کو خود رہنما کے منشاء کے مطابق ایک خاص ترتیب سے جمع کر دیے گئے اور اسی مجموعہ کا نام قرآن ہے۔

وہ دعوتِ حق جو آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے عرب میں اٹھی اور جس کی رہنمائی خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی، قرآن اس کا معتبر ترین ریکارڈ ہے۔ یہ ان خدائی ہدایات کا مجموعہ ہے جو اس تحریک کی رہنمائی کے لیے تقریباً ایک چوتھائی صدی کے درمیان مختلف اوقات میں بھیجے گئے تھے۔ مگر یہ قرآن صرف تاریخ نہیں ہے، وہ خدا کا مستقل فرمان ہے جو تاریخ کے سانچے میں ڈھال کر ہمیں دیا گیا ہے۔ وہ تاریخ ہے اس لیے کہ وہ ایک عملی نمونہ ہے، اور عملی نصیحت کے لیے مہیّا کیا گیا ہے، وہ مستقل فرمان ہے اس لیے کہ مالک کائنات کے فیصلہ کے مطابق اسی کی بنیاد پر ہر دور کے انسان کی سعادت و شقاوت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔

مگر اس خاص ترتیب کے باوجود قرآن اس قسم کے مجموعوں سے بالکل مختلف ہے، جیسے آج کل سیاسی لیڈروں کی تقریروں کے مجموعے چھپتے ہیں۔ یہ عالم الغیب کی ایک باکمال منصوبہ بندی ہے۔ قرآن کے مختلف اجزاء ایک طویل زمانے میں الگ الگ بھیجے گئے، مگر یہ مختلف ٹکڑے محض اتفاق کے طور پر وجود میں نہیں آ گئے تھے، بلکہ وہ ایک مرتب اسکیم کے اجزاء تھے جو عملی ضرورت کے تحت مختلف اوقات میں مختلف ترتیب کے ساتھ نازل ہوئے۔ اسکیم کے اختتام پر جب انھیں مکمل کرکے جوڑ دیا گیا تو اب وہ ایک لاجواب وحدت بن گئے ہیں۔

مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ ہندوستان کے لیے ایک نو تعمیر کارخانہ کا سامان سمندر کے پار کسی ملک میں تیار کیا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ سامان وہاں کے مختلف کارخانوں میں الگ الگ بنے گا اور تمام سامان الگ الگ جہازوں میں بھر کر ہندوستان روانہ کر دیا جائے گا۔ بظاہر دیکھیے تو تیاری کے پورے مرحلے میں یہ کارخانہ متفرق اور نامکمل چیزوں کا ڈھیر معلوم ہوتا ہے مگر یہ سامان جو مختلف جہازوں پر لد کر آیا ہے جب یہاں اسکے تمام حصوں کو جوڑ دیا جاتا ہے تو ایک پورا کارخانہ ہماری نظروں کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ تقریباً یہی معاملہ قرآن کے ساتھ ہوا ہے۔ وہ مستقل اور مکمل دستور حیات ہے اس لیے وہ ایک وحدت ہے۔ وہ مخالف ماحول کا مقابلہ کرکے اس کو موافق بنانے کا پیغام ہے، اس لیے حالات و ضروریات کے تحت تھوڑا تھوڑا کرکے نازل کیا گیا ہے۔ تاریخی اعتبار سے وہ متفرق احکام کا مجموعہ ہے مگر خدائے عزیز و حکیم کی منصوبہ بندی نے اس کو ایک نہایت مرتب اور مکمل وحدت بنا دیا ہے۔

آج دنیا میں اربوں اور کھربوں کی تعداد میں کتابیں چھپ کر شائع ہو چکی ہیں۔ایک ایک فن اور ہر فن کے مختلف شعبوں پر اتنی کثیر تعداد میں کتابیں لکھی گئی ہیں کہ آدمی ساری عمر ان کا مطالعہ کرتا رہے، مگر قرآن ایک ایسی کتاب ہے کہ دنیا میں تمام کتابوں کا مطالعہ بھی آدمی کو اس سے بے نیاز نہیں کر سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسری کتابوں کے مطالعہ سے کوئی شخص صحیح معنوں میں اسی وقت مستفید ہو سکتا ہے، جب اسے قرآن کے ذریعہ وہ بصیرت حاصل ہو چکی ہو جو ہر معاملہ میں فیصلے تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے۔ بحری جہازوں کے لیے ناپید اکنار سمندر میں قطب نما کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح زندگی کے الجھے ہوئے مسائل میں صحیح رائے پر پہنچنے کے لیے وحی الٰہی کی ضرورت ہے، جو اس روشنی سے بہرہ مند ہو گا وہ ہر گہرائی سے اپنی زندگی کی کشتی پار اتار لے گا اور جو اس روشنی سے محروم ہو گا وہ زندگی کے مسائل میں الجھ کر رہ جائے گا اور کسی صحیح نتیجے تک نہ پہنچ سکے گا۔

قرآن فطرت کے اس خلا کو پُر کرتا ہے جس نے تاریخ کے ہر دور میں انسان کو بے چین کر رکھا ہے۔ روسو نے کہا تھا کہ :

"انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر میں ہر طرف اس کو زنجیر میں جکڑا ہو پاتا ہوں۔"

میں کہوں گا کہ انسان فطرتاً بندہ پیدا ہوا ہے، مگر وہ مصنوعی طور پر آقا بننا چاہتا ہے۔ انسان بظاہر ایک مکمل وجود معلوم ہوتا ہے مگر در حقیقت وہ سراپا محتاج ہے۔ جس طرح اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے اس کو ہوا، پانی، اور دوسری زمینی پیداوار کی ضرورت ہے، اسی طرح اس کو ذہنی زندگی کے لیے بھی ایک خارجی سہارے کی ضرورت ہے۔ انسان فطرتاً ایک ایسا سہارا چاہتا ہے جس پر وہ مشکل حالات میں اعتماد کر سکے۔ اس کو

ایک ایسی قریبی ہستی کی ضرورت ہے جس کے آگے وہ اپنا سر جھکادے۔ جب وہ تکلیف میں ہو تو کسی حاجت روا کے سامنے ہاتھ اُٹھا سکے۔ جب اسے خوشی ہو تو کسی محسن کے سامنے سجدۂ شکر بجالائے۔ جس طرح سمندر میں ڈوبنے والا ایک شخص کشتی کا سہارا چاہتا ہے، اسی طرح اس وسیع و عریض کائنات میں انسان کو ایک مضبوط رسّی کی ضرورت ہے جسے وہ تھام سکے۔ کوئی بڑی سے بڑی شخصیت اس کمی سے خالی نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ خلا ذاتِ خداوندی کے ذریعے پُر کیا جائے تو یہ توحید ہے اور اگر اس کو چھوڑ کر کسی دوسری ہستی کا سہارا ڈھونڈا جائے تو یہ شرک ہے۔

تاریخ کے ہر دور میں انسان ان دو میں سے کسی نہ کسی سہارے کو اختیار کرنے پر مجبور رہا ہے۔ جو لوگ توحید کے پرستار ہیں ان کا سہارا قدیم ترین زمانے سے ایک خدا تھا۔ اور اب بھی صرف خدا ہے، مگر شرک کے پرستاروں کے قبلے بدلتے رہے ہیں۔ پہلے زمانے کا انسان اور موجودہ دور میں بھی بہت سے لوگ فضا کے روشن ستاروں سے لے کر درخت اور پتھر تک بے شمار چیزوں کی پرستش کرتے رہے ہیں اور اب موجودہ زمانے میں قوم، وطن، مادی ترقی اور سیاسی برتری کے جذبات نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ انسان کو اب بھی ایک مرکز محبت کی ضرورت ہے۔ وہ اب بھی اپنی دوڑ دھوپ کے لیے کوئی منتہا چاہتا ہے۔ اس کو اب بھی اس کی تڑپ ہے کہ کسی کی یاد سے دل کو گرمائے اور زندگی کی توانائی حاصل کرے۔ یہ نئے نئے بت دراصل اسی خلا کو پُر کرنے کے لیے گھڑے گئے ہیں، مگر جس طرح پتھر کا بُت کوئی واقعی سہارا نہ تھا جو انسان کے کسی کام آسکتا، اسی طرح موجودہ زمانے کے یہ چمکدار بُت بھی نہایت کمزور ہیں جو کسی قوم کو حقیقی طاقت نہیں دے سکتے۔

جرمنی نے قومیت کو اپنا بُت بنایا مگر یہ بُت اس کے کام نہ آسکا اور دوسری جنگ عظیم نے اس کو فنا کردیا، اٹلی اور جاپان وطن کے بُت کو لے کر اٹھے مگر یہ بت خود ان کے وطن کو ان کے لیے قبرستان بننے سے نہ روک سکا۔ برطانیہ اور فرانس نے مادّی اسباب کو بُت بنایا مگر وہ ان کے کام نہ آیا اور جس سلطنت میں آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا اس کا آفتاب غروب ہو کر رہا۔

قرآن ہم کو بتاتا ہے کہ اس کائنات میں طاقت کا اصل خزانہ کہاں ہے وہ ہمارے ہاتھ میں اس مضبوط رسّی کا سرا دیتا ہے جس کو ٹوٹنا نہیں ہے اور جس کے سوا در حقیقت اس دنیا میں کوئی سہارا نہیں ہے۔ قرآن ہم کو بتاتا ہے کہ اس کائنات میں حقیقی سہارا صرف ایک خدا کا ہے، اسی کے ذریعہ دلوں کو سکون ملتا ہے اسی کے ذریعہ زندگی کی حرارت حاصل ہوتی ہے، اس کا تعلق ہی وہ سب سے مضبوط رسی ہے جو مختلف انسانوں کو باہم جوڑتی ہے، وہی نازک مواقع پر ہمارا دستگیر اور مشکل حالات میں ہمارا مددگار ہے۔ اسی کے ہاتھ میں ساری طاقت ہے، عزت اس قوم کے لیے ہے جو اس کا سہارا پکڑے اور جو اس کو چھوڑ دے اس کے لیے ذلّت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہ علم دراصل تمام خزانوں کی کنجی ہے جس کو یہ ملا اسے سب کچھ مل گیا اور جو اس سے محروم رہا وہ ہر چیز سے محروم رہا۔

ہم ان سائنس دانوں کو بڑی اہمیت دیتے ہیں، جنہوں نے بجلی اور بھاپ کی قوتوں کا انکشاف کیا جس سے انسانی تمدن کو ترقی کے مواقع ملے۔ مگر یہ کتاب جس حقیقت کا انکشاف کرتی ہے اس کی عظمت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا، یہ صرف مشینوں کا علم نہیں بلکہ اس انسان کا علم ہے جس کے لیے ساری مشینیں بنی ہیں۔ اس کے ذریعہ ہم انسان کو سمجھتے ہیں، اس کے ذریعہ انسان اپنی زندگی کو کامیاب بنانے کا راز معلوم کرتا ہے، اور یہی تاریخ کا

وہ اٹل فیصلہ ہے جس سے قوموں کے بننے اور بگڑنے کا فیصلہ ہوتا ہے۔

قرآن خدا کی آواز ہے، ہر بادشاہ کا ایک دستور ہوتا ہے۔ قرآن خدا کا دستور ہے جو تمام انسانوں کا آقا اور سارے بادشاہوں کا بادشاہ ہے، وہ ہدایت ہے جو انسان کو صحیح راستے کی طرف رہنمائی کرتی ہے، وہ قانون ہے جس میں انسانیت کی تعمیر اور سوسائٹی کی تنظیم کے لیے صحیح ترین بنیادیں ہیں، وہ حکمت ہے جس میں دانائی کی تمام باتیں بھری ہوئی ہیں، وہ شفاء ہے جس میں انسانیت کی بیماریوں کا علاج ہے، وہ فرقان ہے جو حق و باطل کی صحیح صحیح نشاندہی کرتا ہے، وہ روشنی ہے جس سے انسانیت کے بھٹکے ہوئے قافلے راستے پاتے ہیں، وہ یاد دہانی ہے جو انسان کی سوئی ہوئی فطرت کو جگاتی ہے، وہ نصیحت ہو جو مالک کائنات کی طرف سے اپنے بندوں کے پاس بھیجی گئی ہے، غرض اس میں وہ سب کچھ ہے جس کی انسان کو ضرورت ہے اس کے سوا کہیں اور سے آدمی کو کچھ نہیں مل سکتا۔

قرآن خدا کی کتاب ہے، وہ ایک واسطہ ہے جس کے ذریعے خدا اپنے بندوں سے ہمکلام ہوتا ہے وہ دنیا میں خدا کا محسوس نمائندہ ہے۔ وہ ان لوگوں کا سہارا ہے جو خدا کی رسی کو مضبوط پکڑنا چاہتے ہوں، وہ ایک پیمانہ ہے جس سے انسانوں کی خدا پرستی کو ناپا جا سکتا ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ کوئی شخص اپنے متعلق کس طرح یہ معلوم کرے کہ اس کو خدا سے تعلق پیدا ہوا یا نہیں تو اس کا ایک ہی جواب ہے، وہ یہ کہ آدمی اپنے اندر ٹٹول کر دیکھے کہ اس کو قرآن سے کتنا تعلق ہے۔ قرآن سے تعلق ہی خدا سے تعلق کا مظہر ہے۔ آدمی کو قرآن سے جتنا لگاؤ ہو گا خدا سے بھی لگاؤ اسی قدر ہو گا۔ اگر قرآن اس کی محبوب ترین کتاب ہو تو سمجھنا چاہیے کہ خدا اس کے نزدیک محبوب ترین ہستی ہے اور اگر

اس کی محبوب ترین کتاب کوئی اور ہو تو اس کا محبوب بھی وہی شخص ہو گا جس کی کتاب اس نے پسند کی ہے۔ خدا اس کا محبوب نہیں ہو سکتا۔ جس طرح خدا کو ہم قرآن کے سوا کہیں اور نہیں پا سکتے اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ خدا کو پانے کے بعد قرآن کے سوا کوئی اور چیز ہماری محبوب ترین بن سکے۔

قرآن کا مطالعہ کرنے کی ضرورت صرف اس لیے نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ سے آدمی اپنے رب کے احکام معلوم کرتا ہے بلکہ دنیا کی زندگی میں خدا سے قریب ہونے اور بندگی کی راہ پر انسان کو استوار رکھنے کا دار و مدار بھی اسی پر ہے۔ قرآن میں آدمی اپنے رب سے ملاقات کرتا ہے، قرآن میں اس وعدوں اور بشارتوں کو دیکھتا ہے، اپنے آقا اور مالک کے بارے میں انسان کے فطری احساسات جو اس کے اندر غیر شعوری طور پر امنڈتے ہیں، وہ دیکھتا ہے کہ قرآن میں ان کو مصوّر کر دیا گیا ہے۔ جب انسان کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اتھاہ کائنات کے اندر وہ ایک بے سہارا وجود ہے تو قرآن اس کے لیے منزل کا نشان بن کر ظاہر ہوتا ہے۔ قرآن آدمی کے لیے وہ یقین مہیا کرتا ہے جس کے مطابق آدمی دنیا میں اپنا مقام متعین کر سکے۔ قرآن کو محض پڑھ لینا کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ عشق کی ضرورت ہے۔ قرآن سے جب تک غیر معمولی شغف نہ ہو یہ سارے فوائد حاصل نہیں ہو سکتے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو حدیث میں "تعاہد" کے لفظ سے ظاہر کیا گیا ہے: تَعَاهَدُوا الْقُرْآنَ(صحيح البخاري، حدیث نمبر 5033)۔ یعنی قرآن کی حفاظت کرو۔

قرآن سے یہ دل چسپی اور اس کی عظمت کا احساس بالواسطہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ کسی مفسر یا ادیب کی زبان سے قرآن کے مضامین سن کر آدمی اس مفسر یا ادیب کا معتقد تو ہو

سکتا ہے۔ مگر اس طرح قرآن سے حقیقی لگاؤ پیدا ہونا ممکن نہیں۔ قرآن سے تعلق صرف اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب کہ خود قرآن کو پڑھا جائے اور اس کے اندر جو کچھ ہے اس کو براہِ راست اس کے اپنے الفاظ کے ذریعہ سے ذہن میں اتارا جائے یہ محض خیالی بات نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک اہم نفسیاتی حقیقت ہے۔ کسی چیز سے آدمی اسی حیثیت سے متاثر ہوتا ہے جس حیثیت سے وہ اس سے ذاتی طور پر متعارف ہوا ہو۔ مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ روئی اور پتھر کا نرم اور سخت ہونا محض اضافی ہے۔ حقیقتاً دونوں بالکل ایک ہیں کیونکہ اپنے آخری تجزیے میں دونوں ایک ہی طرح کے برقی ذرات کا مجموعہ ہیں۔ مگر یہ ایک خالص علمی بات ہے، حقیقی دنیا میں یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص روئی کو نرم اور پتھر کو سخت نہ سمجھے۔ تاثر کبھی خارجی علم کا پابند نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف اس علم کا پابند ہوتا ہے جو اسے ذاتی طور پر حاصل ہوا ہے۔

اس مثال کی روشنی میں مسئلے کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ جب ہم قرآن کو خود اس کے لفظوں میں سمجھے بغیر کسی دوسرے شخص کے مضامین اور اس کی تشریحات کے ذریعہ اس کا علم حاصل کرتے ہیں تو قدرتی طور پر جو صورتِ حال پیدا ہوتی ہے وہ یہ کہ ایک طرف قرآن کی عبارت ہوتی ہے جس کا کوئی مطلب ہماری سمجھ میں نہیں آتا یا اگر سمجھ میں آتا ہے تو بہت معمولی سا۔ اور دوسری طرف ایک مصنف کی تحریر ہوتی ہے جو ہمارے لیے ایک قابلِ فہم زبان میں ہونے کی وجہ سے خود اپنے آپ کو واضح کرتی ہے۔ خدا کا کلام سمجھ میں نہیں آتا، مگر مصنّف کا کلام خوب سمجھ میں آتا ہے۔ خدا کی بات میں کوئی خاص معنویت دکھائی نہیں دیتی اور مصنف کا کلام نہایت بامعنیٰ نظر آتا ہے۔ خدا کا کلام پڑھیے تو وہ دل کے اوپر اپنا کوئی اثر نہیں ڈالتا

مگر مصنّف کی عبارت دیکھئے تو رگ رگ میں پیوست ہوتی چلی جاتی ہیں۔ یہ دو مختلف عبارتوں کا دو بالکل مختلف حیثیتوں سے تعارف ہے جو انسان کو حاصل ہوتا ہے۔ آدمی کا خارجی علم کہتا ہے کہ کلامِ برتر وہ ہے جو سمجھ میں نہیں آتا یا اگر سمجھ میں آتا ہے تو اس کے اندر کوئی بڑی بات نہیں ہے اور حقیقی تعارف یہ محسوس کراتا ہے کہ کلامِ برتر وہ ہے جو اپنی حیثیت کو خود تمہارے اوپر واضح کر رہا ہے۔ اس صورتِ حال کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرآن کے بجائے کسی مصنّف کی عظمت اس کے دل پر نقش ہو جاتی ہے۔ روایتی ایمان کی بنا پر وہ اپنی زبان سے یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ مصنّف کی تحریروں کو قرآن پر ترجیح دیتا ہے مگر اس کا اندرونی احساس اس قسم کا ہو جاتا ہے گویا اصل واقعہ یہی ہے۔ وہ غیر شعوری طور پر خدا کے سوا کسی اور شخصیت کی پرستش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

یہ ایک عظیم فتنہ ہے جس کا خطرہ ہر اس شخص کو لاحق ہے جو خدا کے پیغام کو اس کی اپنی زبان کے بجائے کسی دوسرے کی زبان سے سننا چاہتا ہو، جو قرآن کا براہِ راست مطالعہ کرنے کے بجائے اس کے متعلق دوسرے لوگوں کی تحریروں کو پڑھ لینا کافی سمجھتا ہو، جو قرآن کو خود قرآن سے سمجھنے کے بجائے قرآن کو مفسّروں اور ادیبوں کی تحریروں سے سمجھنا چاہتا ہو، جس طرح ہم اپنے پیٹ کی بھوک اسی وقت بجھا سکتے ہیں جب کہ خود کھائیں اور اپنے اندر ہضم کریں ٹھیک اسی طرح ہمارا ایمان بھی اسی وقت صحیح اور مکمل ہو سکتا ہے، جب کہ ہم نے اس کے اصل ماخذ سے خود حاصل کیا ہو۔ کسی دوسرے کے واسطے سے ہم اس تک ٹھیک نہیں پہنچ سکتے۔

قرآن کے سلسلے میں یہ ایک اہم سوال ہے کہ قرآن کا مطالعہ کس طرح کیا جائے کہ

وہ اپنی صحیح شکل میں ہمارے ذہنوں میں اتر جائے اور ہماری زندگی میں حقیقی طور پر شامل ہو سکے۔ اس کے لیے سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ قرآن کا مطالعہ خود قرآن کی روشنی میں کیا جائے نہ کہ کسی اور چیز کی روشنی میں، یہ مطالعہ لازمی طور پر قرآن کو سمجھنے کے لیے ہونا چاہیے نہ کہ اپنی پہلے سے کسی طے کی ہوئی بات کو اس سے نکالنے کے لیے۔ جب بھی کوئی شخص متاثر ذہن کے ساتھ قرآن کا مطالعہ کرے گا وہ قرآن کو صحیح طور پر اخذ نہیں کر سکتا، ایسا آدمی قرآن کے آئینے میں اپنی بات دیکھے گا، نہ کہ قرآن کی بات کو۔

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ انسان کے ذہن میں کسی مطالعہ کے نتائج ہمیشہ اس تصور کے مطابق مرتب ہوتے ہیں جو پہلے سے اس کے ذہن میں موجود ہو۔ انسان کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ چیزوں کو صرف اس حیثیت سے دیکھے جیسے کہ وہ فی الواقع ہوں۔ اکثر حالات میں وہ مجبور ہوتا ہے کہ چیزوں کو اس حیثیت سے دیکھے جیسا کہ اس کا ذہن اسے دیکھنا چاہتا ہے۔ اس طرح جب کوئی شخص ایک خاص ذہن لے کر قرآن کا مطالعہ کرتا ہے تو عملاً یہ ہوتا ہے کہ وہ قرآن کی بعض باتوں کو تو لے لیتا ہے جو اس کے ذہن کے چوکھٹے میں بیٹھ سکتی ہوں اور باقی تمام باتوں کو چھوڑتا چلا جاتا ہے۔

اس طرح وہ سارا قرآن پڑھ لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس نے قرآن کو پالیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ قرآن سے بالکل بے خبر ہوتا ہے۔ اس نے جو چیز پائی ہے وہ وہی ہے جو اس کے ذہن میں پہلے سے موجود تھی اور جس کی تائید میں اتفاق سے قرآن کی بعض آیتیں بھی اسے ہاتھ آ گئیں۔ ایسے آدمی کی مثال بالکل اس تعلیم یافتہ نوجوان کی سی ہے جو اپنی بے کاری سے پریشان ہو اور صرف "ضرورتِ ملازمت" کے اشتہارات دیکھنے کے لیے اخبار کا مطالعہ کرتا ہو۔ یہ

نوجوان اپنے اس مطالعہ کے ذریعہ سے ممکن ہے ملازمت کی درخواست بھیجنے کے لیے کچھ پتے حاصل کرلے مگر وہ دنیا کی سیاست سے بالکل بے خبر رہے گا اور اخبار بینی کے اصل مقصد کو حاصل نہ کر سکے گا۔

متاثر ذہن کے ساتھ قرآن کا مطالعہ کرنے کی مختلف صورتیں ہیں، جن میں سب سے زیادہ خطرناک صورت وہ ہے، جب کہ آدمی سمجھ رہا ہو کہ وہ اسلام ہی کے لیے قرآن کا مطالعہ کرنے جارہا ہے۔ حالانکہ واقعتاً ایسا نہ ہو۔ فرض کیجیے کہ آپ ایک ایسی تحریک سے متاثر ہوتے ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے لیے اٹھی ہے مگر وہ صحیح اسلامی تحریک نہیں ہے (مثال کے طور پر خاکسار تحریک)۔ اس کا انداز اور اس کی روح اسلام کے انداز اور اس کی روح سے مختلف ہے۔ وہ لوگوں کو اسلام کے نام پر بلاتی ہے، اور اپنی دعوت کی تشریح کے لیے اسلامی الفاظ اور اصطلاحات استعمال کرتی ہے، مگر اس کی حرکت ٹھیک اس سمت میں نہیں ہے جو کہ دراصل اسلام کی ہے۔

اس مثال میں حقیقی صورتِ حال یہ ہے کہ جس تحریک نے آپ کو متاثر کیا ہے وہ صحیح اسلامی تحریک نہیں ہے مگر آپ کے ذہن میں جو تصور قائم ہوا ہے وہ یہ کہ یہی صحیح ترین اسلامی تحریک ہے اور اس کی خدمت کرنا اسلام کی خدمت کرنا ہے۔ اس تحریک نے آپ کی فکری قوتوں کو اپنے انداز کے مطابق موڑ دیا ہے۔ اب ایک ایسا ذہن لے کر جب آپ قرآن کا مطالعہ شروع کریں گے تو بظاہر آپ یہ سمجھیں گے کہ آپ قرآن کو حاصل کرنے جارہے ہیں مگر جو واقعہ ہے وہ یہ کہ آپ قرآن کے لفظوں میں اپنی بات کی تصدیق کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح مطالعہ کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ قرآن کی بہت سی چیزیں آپ کو بے کار معلوم ہوں

گی۔ کیونکہ وہ آپ کے ذہنی سانچے کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتیں اور کچھ چیزیں ایسی ہوں گی جو آپ کو پسند آجائیں گی۔ کیونکہ وہ آپ کے ذہنی سانچے میں بیٹھ رہی ہیں۔ اس طرح آپ قرآن کی کچھ باتوں کو لے لیں گے اور اس کی بہت سی باتوں کو چھوڑ دیں گے۔ آپ اپنے طور پر یہ سمجھتے رہیں گے کہ آپ نے قرآن کو پالیا ہے۔ مگر جو حقیقت ہو گی وہ یہ کہ آپ قرآن سے محروم ہوں گے۔ آپ اسلام کے نام پر خود اسلام کو چھوڑ دیں گے۔ آپ قرآن کے حوالے سے گفتگو کریں گے۔ مگر حقیقتاً آپ کی گفتگو کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ اس طرح مطالعہ کے وقت انسان کا ذہنی تصور جس درجے میں اسلام سے ہٹا ہوا ہو۔ اسی کے بقدر اس کے مطالعہ قرآن میں نقص ہو جاتا ہے۔

آپ کہیں گے کہ جب صورتِ حال یہ ہے تو کسی کے بارے میں بھی یقین نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا مطالعہ اس کو صحیح نتائج تک پہنچا سکے گا۔ کیونکہ قرآن کے مطالعے کے بعد ہی تو قرآن کے مطابق کسی کا ذہن بن سکتا ہے۔ پھر ایک شخص جو ابھی قرآن کا مطالعہ کرنے جا رہا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ پہلی بار ہر شخص کی یہی حیثیت ہوتی ہے تو وہ کس طرح قرآن کے مطابق اپنے ذہن کو بنا سکتا ہے۔

جواب یہ ہے کہ میرا مطلب یہ نہیں کہ مطالعہ کرنے سے پہلے آدمی کا ذہن قرآن کے مطابق بن چکا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ بات ناممکن ہے۔ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ اس کے اندر اس بات کی صلاحیت ہونی چاہیے کہ قرآن سے جو کچھ اسے ملے وہ اس کو بے چون وچرا قبول کر لے۔ علماء نے یہ کہا کہ قرآن سے صحیح طور پر استفادہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اس کے لیے خدا سے دعا کرے۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ آدمی کے اندر ہدایت کو قبول

کرنے کی آمادگی ہونی چاہیے۔ دعا کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کچھ مخصوص الفاظ اپنی زبان سے ادا کرکے تلاوت کا آغاز کیا جائے۔ بلکہ یہ دعا دراصل دل کی اس تڑپ کا اظہار ہے کہ بندہ ہدایت قبول کرنے کے لیے بے تاب ہے، وہ حقیقت کی تلاش میں سرگرداں ہے، اس کی طلب پوری طرح ابھری ہوئی ہے، وہ ہمہ تن طالبِ حق بن کر خدا سے درخواست کر رہا ہے کہ وہ اسے روشنی دے۔ وہ اس کے اندر صحیح خیالات کا فیضان کرے، وہ قرآن کے مطالب کو اس کے لیے کھول دے تاکہ وہ اسے جذب کر سکے۔ یہی جذبۂ طلب دراصل وہ چیز ہے جو آدمی کو قبول حق تک لے جاتی ہے اور جس نے اپنی فطری طلب پر خواہشات کے پردے ڈال لیے ہوں اسے کبھی حق کو قبول کرنے کی توفیق نہیں مل سکتی۔

اب سوال یہ ہے کہ قرآن کا مطالعہ کرنے کے لیے ہم کو اور کون سے علوم جاننے کی ضرورت ہے۔ اس گفتگو کو میں دو حصوں میں تقسیم کر دوں گا۔ قرآن کے طالب علم دو قسم کے ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو زیادہ مطالعہ کرنے کے خواہش مند ہوں اور دوسرے وہ جو اپنے حالات کے تحت اس کو صرف سادہ طریقے پر پڑھنا چاہتے ہوں۔ دوسری قسم کے لوگوں کے لیے صرف ایک چیز سیکھ لینا کافی ہے، یعنی قرآن کی زبان۔ اور پہلی قسم کے لوگوں کو اس کے علاوہ مزید چار علوم میں واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ اس طرح دونوں گروہ کے لحاظ سے یہ کل پانچ متعلق علوم ہوئے جو کہ حسبِ ذیل ہیں:

1۔ عربی زبان

2۔ حدیث اور تفسیر

3۔ سائنس یعنی علوم فطرت

4۔ان قوموں کی تاریخ جن میں خدا کے رسول آئے

5۔قدیم آسمانی صحیفے

(1) قرآن کا مطالعہ کرنے کے لیے عربی زبان کا جاننا بالکل لازمی ہے۔اس کی اہمیت کسی ذاتی شرف کی بناپر نہیں ہے بلکہ صرف اس اعتبار سے ہے کہ اس کے بغیر مطالعہ قرآن کی ابتداء ہی نہیں کی جاسکتی۔ یہ اس سفر کا پہلا زینہ ہے جس کو طے کیے بغیر اوپر چڑھا نہیں جاسکتا۔ عربی زبان سے واقف ہونے کی ضرورت کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس کے بغیر ہم آیاتِ الٰہی کا مطلب نہیں سمجھ سکتے۔ ظاہر ہے کہ کوئی کتاب جس زبان میں ہواس زبان کو جانے بغیر کتاب کو سمجھنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ مگر عربی جاننے کی ضرورت ہم کو صرف اسی لیے نہیں ہے۔اگراس کی ضرورت صرف اسی قدر ہوتی تو یہ کام ترجموں کے ذریعہ بھی لیا جاسکتا تھا۔اس سے آگے بڑھ کر عربی زبان سے واقف ہونے کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ قرآن کے لفظوں میں جو زور اور اثر انگیزی بھری ہوئی ہے اس کو اپنے ذہن میں منتقل کرنااس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک آدمی اس کی ادبی نزاکتوں سے آشنا نہ ہو۔

ہر عبارت کا ایک مطلب ہوتا ہے جس کے لیے وہ ترتیب دی جاتی ہے۔ یہ مطلب اس طرح بھی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ ان لفظوں کا ترجمہ کر دیا جائے جن میں وہ عبارت مرتب کی گئی ہے یا ڈکشنری میں دیکھ کر اس کو حل کر لیا جائے۔ مگر اسی کے ساتھ ہر کامیاب عبارت میں ایک تاثیر بھی ہوتی ہے جو پڑھنے والے کو اپنی معانی کی طرف کھینچتی ہے ۔یہ تاثیر معانی سے زیادہ اس کے الفاظ اور انداز بیان میں ہوتی ہے۔عبارت جن لفظوں میں مرتب کی گئی ہے اگر آدمی ان الفاظ کی حکمت اور بلاغت کو نہ جانتا ہو تو وہ اس

کے ترجمے سے اس کا مطلب تو شاید سمجھ جائے مگر اس سے کوئی اثر قبول نہیں کر سکتا۔

قرآن کی عبارتوں میں بے پناہ روانی ہے، اس کے اندر حیرت انگیز طور پر معانی کو لفظوں کی صورت میں مجسم کر دیا گیا ہے۔ قرآن میں کہیں یقین پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، کہیں خدا کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے، کہیں اعمالِ خیر پر ابھارا گیا ہے، کہیں اپنے دعوے کے حق میں انسان کی فطرت اور کائنات کی شہادتوں سے استدلال کیا گیا ہے، کہیں انسان کی کامیابی وناکامی کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔ مگر یہ سب کچھ صرف بیانِ واقعہ کے طور پر نہیں ہے بلکہ ایسے بلیغ اور موثر انداز میں ہے کہ ہر جگہ آدمی پر وہی کیفیت طاری ہوتی ہے جو کہ دراصل وہاں مقصود ہے۔ قرآن کا اندازِ بیان ایسا مسحور کن ہے کہ آدمی اس کو صرف پڑھتا نہیں بلکہ اس میں غرق ہو جاتا ہے وہ اس کو صرف پڑھ کر چھوڑ نہیں دیتا بلکہ وہ مجبور ہوتا ہے کہ اس پر ایمان لائے۔ قرآن کا یہ اسلوب نصفِ قرآن ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے عربی زبان کا سیکھنا نہایت ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی ضرورت ہے جس کا حقیقی معنوں میں کوئی بدل نہیں۔ آخرت میں خدا کے نیک بندوں کو اپنے رب سے جو قربت نصیب ہو گی وہ دراصل اس کوشش کا نتیجہ ہو گی جو دنیا میں آدمی اپنے رب سے قریب ہونے کے لیے کرتا ہے اور یہ قربت کلامِ الٰہی سے گہرا تعلق قائم کیے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اس لیے جو شخص بھی خدا کا بندہ بننا چاہتا ہو اور آخرت میں خدا کی رحمت حاصل کرنے کا امیدوار ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کتاب کی زبان سیکھے جس میں اللہ تعالیٰ نے اس سے کلام کیا ہے۔ آخرت کے مسافر کے لیے عربی زبان کا سیکھنا بالکل اسی قسم کی ایک ضرورت ہے جیسے کسی غیر ملک کی

سفارت حاصل کرنے کے لیے اس ملک کے حالات جاننا اور وہاں کی زبان سیکھنا۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی ضرورت مسلّم، مگر موجودہ زمانے میں ہر شخص کو اتنا موقع کہاں ہے کہ وہ ایک غیر ملک کی زبان میں واقفیت اور مہارت حاصل کرے۔ مگر کیا فی الواقع صورت حال یہی ہے کہ موجودہ زمانے کے انسان کے لیے کوئی نئ زبان سیکھنا یا کسی زبان میں اپنی واقفیت کو بڑھانا ممکن نہیں رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے، یہ کام آج جتنا کیا جا رہا ہے، پہلے شاید کبھی نہیں کیا گیا تھا۔ ہماری آنکھوں نے یہ تماشہ دیکھا ہے کہ آزادی کے بعد ملک کے جن مقامات پر ہندی کو سرکاری کام کا ذریعہ قرار دیا گیا تھا وہاں کے وہ ملازمین جو اب تک ہندی زبان سے ناواقف تھے، انہوں نے دن رات ایک کر کے ہندی زبان سیکھی اور اب اس قدر بے تکلفی کے ساتھ ہندی میں کام کرتے ہیں گویا وہ ہمیشہ سے اس کو جانتے تھے۔ اسی طرح جو لوگ دنیوی ترقی چاہتے ہیں ان کو ہم عام طور پر دیکھتے ہیں کہ پرائیویٹ طور پر تیاری کر کے بی،اے، اور ایم،اے، کے امتحانات دیتے رہتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ دوسرا کام کرتے ہوئے انجام دیا جاتا ہے۔ اس سے صریح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ کمی اگر ہے تو فرصت کی نہیں بلکہ ارادے کی ہے، اگر یہ چیز موجود ہو تو نئ زبان بھی سیکھی جا سکتی ہے اور دوسری مصروفیتوں کے ساتھ ایک غیر زبان میں اپنی واقفیت بڑھانے کا سلسلہ بھی جاری رہ سکتا ہے۔

سادہ انداز میں قرآن سے استفادہ کرنے کے لیے صرف عربی زبان کا جاننا کافی ہے۔ مگر جو لوگ زیادہ گہرائی کے ساتھ قرآن کا مطالعہ کرنا چاہتے ہوں ان کے لیے مزید چند چیزوں میں واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔

(2) قرآن کا گہرا مطالعہ کرنے کے لیے پہلی مددگار چیز سنت اور تفسیر کا علم ہے۔ ان دونوں کو ہم نے ایک خانے میں اس لیے نہیں رکھا ہے کہ دونوں کا مقام ایک ہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سنتِ صحیحہ اور قرآن میں کوئی فرق نہیں۔ ان میں سے ایک کا مطالعہ کرنا گویا دوسرے کا مطالعہ کرنا ہے۔ اس کے برعکس، تفسیر کسی انسان کے مطالعہ قرآن کے نتائج کا نام ہے، اور انسان کا مطالعہ خواہ وہ کسی بھی شخص کا ہو، اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔ اس لیے تفسیر کبھی قرآن کی جگہ نہیں لے سکتی اور نہ اس کو کسی حال میں سنت کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ اس فرق کے باوجود ان دونوں کو ایک سلسلے میں رکھنے کی وجہ دراصل وہ تاریخی نوعیت ہے، جو قرآن کے مقابلے میں اسے حاصل ہے۔ قرآن جس طرح مکمل اور محفوظ شکل میں ہم تک پہنچا ہے روایات اسی طرح ہم تک نہیں پہنچی ہیں۔ صحیح روایات کے ساتھ بہت سی غلط روایات بھی شامل ہو گئیں ہیں۔ اسی لیے علماء نے قرآن کے مقابلے میں اس کو قطعی علم کے بجائے ظنی علم کی حیثیت دی ہے۔ اگر احادیث میں ظن اور شبہ کا دخل نہ ہوتا اور ان کا ایسا کوئی ذخیرہ موجود ہوتا جس کو قطعی طور پر محفوظ قرار دیا جا سکے تو احادیث کو بھی اسی طرح اصل کا درجہ دیا جاتا جیسا کہ خود قرآن کا ہے۔ صرف حدیث ہی نہیں بلکہ وہ تمام مآخذ جو قرآن سے متعلق ہیں ان سب کا یہی معاملہ ہے۔ مثلاً تاریخ اور گزشتہ انبیاء علیہم السلام کے صحیفے اگر اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہوتے تو یہ سب بھی قرآن ہی کی طرح اصل قرار پاتے اور سب بلا اختلاف ایک دوسرے کی تائید کرتے۔

تفسیر اور روایات کا ذخیرہ قرآن کو سمجھنے کے لیے ایک اہم مددگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ صحیح روایات کی حیثیت یہ ہے کہ وہ خود قرآن لانے والے کی زبان سے قرآن کی

تشریح ہے، وہ ان امور کی تفصیل ہے، جن کو کتابِ الٰہی نے مجمل چھوڑ دیا ہے، وہ ان اشارات کی تعین ہے جن کو قرآن نے واضح نہیں کیا ہے۔ وہ ان مقاصد کی مزید وضاحت ہے جن کے لیے قرآن نازل کیا گیا تھا۔ اس لیے جو شخص قرآن کو سمجھنا چاہتا ہو اس کے لیے لازم ہے کہ مہبطِ قرآن کے ارشادات سے استفادہ کرے۔ اس کے بغیر وہ قرآن کے مطالب تک نہیں پہنچ سکتا۔ اسی طرح تفاسیر کا ذخیرہ امت کے بہترین دماغوں کی کاوش کا نتیجہ ہے جو صدیوں سے قرآن کو سمجھنے کے سلسلے میں وہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ یہ تاریخ کے لمبے ادوار میں قرآن کے مطالعہ کرنے والوں کے نتائج فکر ہیں جن کو چھوڑ کر قرآن کا مطالعہ کرنا بالکل ایسا ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ پچھلی صدیوں میں سائنس نے جو کچھ دریافتیں کی ہیں ان سب کو چھوڑ کر میں از سر نو کائنات پر غور کروں گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم قرآن کے مطالعہ کے لیے تفسیر اور روایات کے ذخیرے سے مدد لیں۔ ان کو چھوڑ کر قرآن کا مطالعہ کرنا ایک سر پھرے آدمی کا کام تو ہو سکتا ہے مگر کوئی سنجیدہ آدمی ہرگز اس قسم کی حماقت نہیں کر سکتا۔

(3) قرآن نے اپنی دعوت پیش کرتے ہوئے دو چیزوں سے خاص طور پر استدلال کیا ہے۔ ایک زمین و آسمان کی تخلیق اور دوسرے پچھلی قوموں کے حالات۔ قرآن کا یہ عام اسلوب ہے کہ اپنے دعوے کے حق میں فطرت کے دلائل دے کر تاریخی واقعات سے اس کا مزید استحکام کرے۔ پہلی چیز اس واقعہ کی محسوس شہادت ہے کہ اس دنیا کا ایک خدا ہے جس کی مرضی معلوم کرنا ہمارے لیے ضروری ہے، اس کو چھوڑ کر انسان کامیابی تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور دوسری چیز اس بات کا ثبوت ہے کہ خدا ہر زمانے میں کچھ انسانوں کے ذریعہ اپنی

مرضی بھیجتا رہا ہے۔ جن لوگوں نے اس کو قبول کیا وہ کامیاب ہوئے اور جنھوں نے اس کو نہیں مانا وہ تباہ کر دیے گئے۔ کائنات زبان حال سے جس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے، اقوام سابقہ کی تاریخ زبانِ قال سے اسی حقیقت کی تصدیق کرتی ہے۔

یہ دونوں دلیلیں آج بھی قرآن کو سمجھنے اور اس پر ایمان لانے کے سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ قرآن اگرچہ سائنس کی کتاب نہیں ہے اور نہ وہ عام معنوں میں کوئی تاریخ ہے۔ مگر سائنس اور تاریخ یہی وہ خاص علوم ہیں جن پر ان کے استدلال کی بنیاد قائم ہے۔ اس لیے قرآن کا کوئی طالب علم ان علوم سے بے نیاز رہ کر قرآن سے صحیح فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

پہلے قسم کے استدلال کے سلسلے میں قرآن نے آفاق و انفس کی بہت سی نشانیوں کا ذکر کیا ہے اور ان پر غور کرنے کی دعوت دی ہے۔ یہ دلائل قرآن میں اس طرح نہیں آئے ہیں کہ ان کا تفصیلی تجزیہ کرکے سائنٹفک انداز میں ان کے نتائج مرتب کیے گئے ہوں بلکہ کائنات کی نشانیوں کا ذکر کرکے ان کی مختلف جہتوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے، جو غور کرنے والے کے لیے رہ نمائی کا کام دیتی ہیں۔ گویا دلائل کی تفصیل نہیں ہے بلکہ دلائل کے عنوانات ہیں۔ اس لیے ان سے پورا فائدہ اسی وقت حاصل کیا جا سکتا ہے جب کہ کائنات کے متعلق مزید معلومات کو سامنے رکھ کر ان کا مطالعہ کیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں وہ معلومات اور نتائج آدمی کے ذہن میں ہونے چاہئیں جن سے ان دلائل کی وضاحت ہوتی ہے اور جو اس کے اشارات کو مفصّل بنانے والے ہیں۔

مثلاً قرآن کہتا ہے: هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا (67:15)۔ وہی ہے جس نے زمین کو تمھارے لیے فرمانبردار بنایا تو چلو

پھر واس کے راستوں میں۔

ان الفاظ میں جس عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کی تفصیل ہم کو قرآن میں نہیں ملے گی بلکہ خارجی لٹریچر میں اس کو تلاش کرنا پڑے گا۔ خارجی مطالعہ سے ہمیں یہ معلوم ہو گا کہ زمین کو کس طرح اتھاہ خلا کے اندر ٹھہرا کر ہمارے لیے قابل رہائش بنایا گیا ہے اور کس طرح مختلف قسم کے اہتمام کے ذریعہ اس کو زندگی کے بقاء اور انسانی تمدّن کے ارتقاء کے لیے ساز گار بنایا گیا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ اس کائنات کا خالق اور اس کا مدّبر صرف ایک خدائے وحدہ لاشریک ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ یہ کائنات ایک الل ٹپ کارخانہ نہیں ہے بلکہ ایک منظّم اسکیم کا آغاز ہے جس کا انجام آنا چاہیے۔ کائنات کی اس حقیقت کو واضح کرنے کے بعد وہ انسان کو اس کے ماننے کی دعوت دیتا ہے، وہ اس سے کہتا ہے کہ اس تصور کائنات کے لازم معنی یہ ہیں کہ کائنات کا انجام خدا کے ہاتھ میں ہو اور کائنات کی تمام چیزوں کے لیے کامیابی کا راستہ صرف یہ ہو کہ خدا کی مرضی کو پالیں۔ اس طرح وہ رسالت اور وحی کی ضرورت ثابت کر کے اس کی طرف بلاتا ہے۔ پھر وہ انسان کو کائنات کے ان انتظامات کی یاد دلاتا ہے جو خدا نے انسان کے لیے کیے ہیں اور جن کے بغیر انسانی زندگی کا تصور نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ان احسانات کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آدمی اپنے محسن کے آگے جھک جائے، پھر وہ انسان کو بتاتا ہے کہ وہ کس قدر عاجز اور حقیر مخلوق ہے اور خود اس کے اپنے عجز ہی کا یہ تقاضا ہے کہ وہ خدا کی رسّی کو مضبوط تھام لے، جس کے سوا در اصل یہاں کوئی سہارا نہیں ہے۔

یہ تمام باتیں جو قرآن پیش کرتا ہے ان سب کے سلسلے میں اس کا اصل استدلال انسان کے اپنے وجود اور زمین و آسمان کے اندر پھیلی ہوئی نشانیوں سے پُر ہے وہ ہمارے مشاہدات اور تجربات ہی کی دلیل سے ہم کو اپنے نظریہ کا مومن بنانا چاہتا ہے اس لیے ان نشانیوں کو صحیح طور پر سمجھنے اور ان سے پورا فائدہ اُٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم کو ان کے بارے میں ضروری علم حاصل ہو۔ جب قرآن کائنات کے کسی واقعے کی طرف اشارہ کرے تو ہم کو معلوم ہو کہ وہ کیا ہے، وہ جب کسی نشانی کا حوالہ دے تو ہم جانتے ہوں کہ ہماری زندگی کے لیے اس کی کیا اہمیت ہے، وہ جب کسی دلیل کا ذکر کرے تو ہم اس دلیل کے اطراف وجوانب سے اتنی واقفیت رکھتے ہیں کہ اس پر غور کر سکیں۔ غرض وہ جب بھی کائنات کے کسی رُخ کو ہمارے سامنے لائے تو ہماری آنکھیں اس کو دیکھنے کے لیے کھلی ہوئی ہوں اور ہمارا ذہن اس کو سمجھنے کے لیے ضروری واقفیت اپنے پاس رکھتا ہو۔

ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ قرآن میں کائنات کی جو دلیلیں مذکور ہوئی ہیں، وہ آخر مجمل انداز ہی میں کیوں ہیں، ان کو اتنا مفصّل ہونا چاہیے تھا کہ قرآن میں ان کو پڑھ لینا کافی ہوتا، خارجی معلومات لے کر اس کا مطالعہ کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ جواب یہ ہے کہ انسانی زبان میں کوئی بھی کتاب ایسی نہیں لکھی جا سکتی جس میں وہ تمام باتیں اپنی ساری تفصیل کے ساتھ درج ہوں جن کا اس کتاب میں ذکر آیا ہے ہر مصنّف کو لازمی طور پر یہ فرض کرنا پڑتا ہے کہ اس کا پڑھنے والا فلاں فلاں قسم کی معلومات پہلے سے رکھتا ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہو تو دنیا میں شاید صرف انسائیکلوپیڈیا کا وجود ہو، کوئی مختصر کتاب لکھی ہی نہ جا سکے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے بہت سے امور میں صرف اشارات سے کام لیا ہے، جو

باتیں وحی کے بغیر معلوم نہیں کی جاسکتیں، ان کی تو قرآن میں پوری تفصیل کی گئی ہے۔ مگر وہ باتیں جن کے جاننے کے لیے لازمی طور پر وحی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ انسان خدا کی دی ہوئی عقل سے کام لے کر بھی انہیں معلوم کر سکتا ہے، ایسی باتوں کی طرف صرف اشارہ کر دیا گیا ہے اور انسان سے کہا گیا ہے کہ ان پر غور کرو۔

اس کے علاوہ قرآن کے اس طرز بیان کے پیچھے ایک اور عظیم مصلحت ہے۔ قرآن ایک عام آدمی کے لیے بھی ہے اور ایک فلسفی کے لیے بھی۔ وہ ماضی کے لیے بھی تھا اور مستقبل کے لیے بھی ہے۔ اس لیے اس نے اپنی گفتگو کا ایسا انداز اختیار کیا جو ڈیڑھ ہزار برس پہلے کے انسان کے لیے قابل فہم ہو سکتا تھا اور پھر ان تمام لوگوں کے لیے بھی اس کے اندر نصیحت ہے جو آئندہ حاصل شدہ معلومات کو ذہن میں رکھ کر قرآن کا مطالعہ کریں۔ قرآن نے ان دلائل کا ذکر کرتے ہوئے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو بعد کے زمانوں میں حاصل شدہ معلومات کو بھی سمیٹ لیتے ہیں۔ یہ قرآنی اندازِ کلام کا اعجاز ہے کہ کائنات کی نشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جس کے اندر ایک ایسا آدمی بھی اپنی تسکین پالیتا ہے جو کائنات کے بارے میں بہت تھوڑی معلومات رکھتا ہو اور انھیں الفاظ میں ایک سائنسداں اور فلسفی کے لیے بھی تسکین و تشفی کا سامان موجود ہے۔

(4) دوسری چیز جس پر قرآن کے استدلال کی بنیاد ہے وہ تاریخ ہے۔ قرآن انسانی تاریخ کو دو دوروں میں تقسیم کرتا ہے، ایک چھٹی صدی عیسوی سے قبل کی تاریخ جس کو وہ اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ وہ حق و باطل کی آویزش کی تاریخ ہے جس میں لازمی طور پر ہمیشہ حق کو غلبہ ہوا ہے اور باطل کو شکست ہوئی ہے۔ قرآن کے مطابق چھٹی صدی عیسوی

تک انسانی تاریخ جس انداز میں سفر کرتی رہی ہے وہ یہ ہے کہ زمین کے اوپر انسان نے جتنی بھی آبادیاں قائم کیں ان میں خدا کی طرف سے ایک نمائندہ (رسول) آیا، اس نے انسانوں کو ان کی زندگی کا مقصد بتایا، اس نے کہا کہ خدا نے مجھ کو یہ پیغام دے کر تمھارے پاس بھیجا ہے کہ تم اس کی بندگی کرو اور میں جو کچھ کہوں اس کو مانو، اس نے کہا کہ اگر تم میری بات نہ مانوگے تو تباہ کر دیے جاؤگے۔ اس طرح نبی کا یہ چیلنج کہ زندگی و موت کا انحصار اس کی دعوت کو ماننے یا نہ ماننے پر ہے، یہ خود نبی کے دعوے کی صحت کو جانچنے کا ایک معیار بن گیا۔ قرآن کہتا ہے کہ تاریخ کسی استثنا کے بغیر مسلسل اس دعوے کے حق میں فیصلہ کرتی آئی ہے۔ جب بھی خدا کا کوئی رسول اٹھا تو کچھ لوگوں نے اس کی دعوت کو مانا اور کچھ لوگوں نے اس کا انکار کیا۔ اگر رسول کے پیروؤں کی تعداد اتنی ہوئی کہ وہ ایک منظّم گروہ کی شکل اختیار کر سکے تو اس کو منکرین کے گروہ سے ٹکرایا گیا اور انہیں شکست دے کر ختم کر دیا گیا، اور اگر رسول کا ساتھ دینے والے بہت کم ہوئے تو خدا نے اپنی غیر معمولی مدد بھیج کر اس کو غالب کیا۔ حجت تمام کرنے کے بعد بالآخر رسول کی زبان سے یہ چیلنج دے دیا گیا:

تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ (11:65)۔ یعنی، اپنی بستیوں میں تین دن اور چل پھر لو (اس کے بعد تمھارے لیے زندگی کا کوئی موقع نہیں) یہ وعدہ جھوٹا نہیں ہے۔

چنانچہ خدا کا عذاب اپنے ٹھیک وقت پر آیا اور نبی اور اس کے پیروؤں کے سوا سب لوگ ہلاک کر دیے گئے۔ اس طرح ہر زمانے میں خدا اپنے رسولوں کو غالب کر کے اس

کے دعوے کا صحیح ہونا ثابت کرتا رہا ہے۔ یہ گویا تاریخ کی شہادت ہے کہ پچھلی تاریخ میں جن لوگوں نے اپنے آپ کو نمائندۂ الٰہی کی حیثیت سے پیش کیا وہ واقعی طور پر خدا کے نمائندے تھے اور انسان کے لیے ضروری ہے کہ ان کی تعلیمات کو اختیار کرے، جو ایسا نہ کرے گا تباہ و برباد ہو جائے گا، ٹھیک یہی صورت حال خود آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں پیش آئی جن کے متعلق حضرت مسیح کا یہ قول پورا ہوا کہ "جو اس سے ٹکرائے گا وہ پاش پاش ہو جائے گا"۔

تاریخ کی یہ نوعیت ہم کو تاریخ کے مطالعہ کی طرف متوجہ کرتی ہے تاکہ ہم قرآن کے ان وعدوں کو سمجھ سکیں جو اس نے پچھلی قوموں کے بارے میں کیے ہیں۔ مگر اس سلسلے میں ایک بڑی زحمت یہ ہے کہ پچھلی تاریخ اپنی اصلی شکل میں محفوظ نہیں ہے، پچھلی صدیوں میں جن لوگوں کے ہاتھوں علوم کا نشوونما ہوا ہے انہوں نے سائنس اور تاریخ دونوں کو مسخ کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ کائنات کا مطالعہ انہوں نے اس ڈھنگ سے کیا گویا وہ بذاتِ خود کوئی مستقل چیز ہے اور اپنے آپ حرکت کرتی ہے یہ مطالعہ ان کو صرف اس حد تک پہنچاتا ہے کہ "جو ہے وہ کیا ہے"۔ وہ اس کی طرف نشاندہی نہیں کرتا کہ "جو کچھ ہو رہا ہے وہ کیوں ہو رہا ہے"۔ اس کے سلسلے میں نہ صرف یہ کہ علماء سائنس خاموشی اختیار کرتے ہیں بلکہ ان میں سے بہت سے لوگوں نے یہ ثابت کرنے کی بھی کوشش کی کہ جو کچھ ہم کو محسوس ہوتا ہے وہی اصل حقیقت ہے اس کے پیچھے کوئی اور حقیقت نہیں۔ کائنات کا حیرت انگیز نظم اور اس کے مختلف اجزاء کا باہمی توافق اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ اس کے پیچھے کوئی بالاتر ذہن کام کر رہا ہے بلکہ یہ محض ایک حسن

اتفاق ہے۔اس کے سوااور کچھ نہیں۔

اسی طرح تاریخ نگاری کا رُخ بھی بالکل دوسرا اختیار کیا گیا ہے۔قدیم تاریخ میں قوموں کے عروج وزوال کے نہایت حیرت انگیز واقعات نظر آتے ہیں زمین کی تہوں سے ایسے نشانات برآمد ہوئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کتنی ترقی یافتہ اور مہذب قومیں تھیں جو زمین کے نیچے دبا دی گئیں۔ مگر ہمارے موٴرخین کے نزدیک ان واقعات کا حق و باطل کی جنگ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔مثلاً مصر کی تاریخ میں فرعون کی غرقابی کا ذکر اس طرح آتا ہے کہ بادشاہ سلامت ایک روز دریا پر نہانے گئے تھے کہ اتفاق سے وہاں ڈوب گئے۔اس طرح سابق مورخین کا نقطۂ نظر اس فلسفۂ تاریخ سے بالکل مختلف ہے جو قرآن نے پیش کیا ہے۔

غرض سائنس اور تاریخ دونوں کا رُخ موجودہ زمانے میں غلط ہو گیا ہے۔تاہم جہاں تک پہلی چیز یعنی علومِ فطرت کا تعلق ہے،اوّلاً تو تمام سائنسدانوں کا انداز یکساں نہیں ہے، دوسرے ان کے اخذ کردہ نتائج کو بھی نہایت آسانی کے ساتھ صحیح رُخ کی طرف موڑا جاسکتا ہے۔ان کے سلسلے میں ہمارا کام صرف یہ ہے کہ جن واقعات کو وہ اتفاق یا قانونِ علّت کا نتیجہ قرار دیتے ہیں،ان کو خدا کے تصّرف کا نتیجہ ثابت کریں۔ مگر تاریخ کے سلسلے میں یہ ایک اہم سوال ہے کہ کیا کیا جائے۔قرآن کے سوا صرف بنی اسرائیل کا مذہبی لٹریچر ہے جو قرآن کے تاریخی نظریے کی تائید کرتا ہے،اس کے علاوہ غالباً کہیں سے بھی اس کی تائید نہیں ملتی۔اس سلسلے میں قرآن کے طالب علم کو بہت سے کام کرنے ہیں۔ مثلاً دوسرے مذاہب کا لٹریچر کا اس حیثیت سے جائزہ لینا کہ وہ قوموں کے عروج وزوال کا کیا

فلسفہ پیش کرتا ہے، ان کے یہاں بہت سی غلط روایات شامل ہو گئی ہیں مگر یہ عین ممکن ہے کہ ایسے اشارات اور ایسی بنیادیں مل سکیں جن سے قرآن کے تصورِ تاریخ کے حق میں استدلالی قرینہ حاصل کیا جا سکے۔ اسی طرح قدیم ترین مورخوں کے یہاں چھان بین کرنی ہے کہ انہوں نے سابقہ اقوام کے حالات میں کیا کچھ بیان کیا ہے، آثار قدیمہ کی کھدائی سے جو نشانات اور کتبات برآمد ہوئے ہیں ان کا جائزہ لے کر دیکھنا ہے کہ ان کے ذریعہ سے قرآن کے فلسفہ تاریخ کی کس حد تک تائید ہوتی ہے۔ یہ ایک بہت مشکل کام ہے مگر قرآنی استدلال کے ایک جزء کو واضح کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس سلسلے میں بھی کچھ کام کیا جائے۔ یہ کام ہر طالب قرآن کا نہیں ہے، مگر کچھ لوگوں کو ضرور یہ کام کرنا چاہیے تاکہ دوسرے لوگ ان کی تحقیقات سے فائدہ اٹھا سکیں۔

علم الحیات کے ماہرین (biologists) کا خیال ہے کہ انسان اپنی موجودہ صلاحیتوں کے ساتھ تقریباً تین لاکھ برس سے اس زمین پر آباد ہے۔ مگر ان کو یہ بات بڑی تعجب خیز معلوم ہوتی ہے کہ موجودہ تمام ذہنی صلاحیتوں کے باوجود انسان کی ترقی کی عمر ابھی چند سو سال ہے۔ اس سے پہلے ہزاروں، لاکھوں برس وہ خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتا رہا اور پتھر کے چند بے ڈھنگے ہتھیار بنانے کے سوا اس نے کوئی نمایاں ترقی نہ کی۔ اس کو اپنے ہتھیاروں کو سیدھی دھار دینے اور آگ کے استعمال کو سیکھنے کے لیے ہزاروں برس درکار ہوئے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اب سے چھ ہزار برس قبل انسان کو وادی نیل میں خودرو جو اگتے ہوئے دکھائی دیے اور اس مشاہدے سے اس نے زراعت کا راز معلوم کیا۔ طریقہ زراعت کے انکشاف اور اس کے اختیار کرنے سے انسان سکونتی زندگی پر مجبور ہوا، اور اس

کے بعد تمدّن کی بنیاد پڑی۔ مگر یہ انسانی تاریخ کا صحیح مطالعہ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمین پر بار بار نہایت شان دار تمدّن پیدا ہوئے اور مٹا دیے گئے، قومیں ابھریں اور فنا ہو گئیں، پچھلے زمانے میں جب نبیوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ کسی قوم میں نبی کا آنا دراصل اس کے لیے خدا کی عدالت کا قائم ہونا تھا۔ تاریخ میں بار بار ایسا ہوا کہ قومیں ابھریں اور انہوں نے بڑے بڑے تمدّن قائم کیے۔

مشہور مورخ سر فلنڈرس (Sir W. M. Flinders Petrie, 1853-1942) نے اپنی کتاب انقلاباتِ تمدّن (*The Revolutions of Civilisation*) میں لکھا ہے کہ تمدّن ایک مظہر ہے جو متوالی ہے، یعنی بار بار آتا ہے:

Civilisation is an intermittent phenomenon.

اس نے ثابت کیا ہے کہ پچھلے دس ہزار برسوں میں تقریباً آٹھ "تمدّنی دور" گزرے ہیں۔ ہر دور سے قبل ایک زمانہ بربریت کا گزرا ہے اور اس کے بعد عہدِ زوال آیا ہے۔ اس نظریہ تاریخ کو اگر صحیح مان لیا جائے تو اس سے بھی ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے۔

مگر جب نبی آیا اور انہوں نے اس کی اطاعت نہیں کی تو خدا کی عدالت سے ان کے لیے فنا کا فیصلہ ہوا اور وہ اپنے بڑے بڑے شہروں اور قلعوں کے ساتھ تباہ کر دی گئیں۔ دوسرے دور کے بعد اب یہ عمل قیامت کے دن ہو گا۔ اس وقت ساری دنیا بیک وقت فنا کر کے تمام انسان خدا کی عدالت میں حاضر کیے جائیں گے، اس صورت حال نے قدیم دور میں تمدّن کو ترقی اور بقاء کے وہ مواقع نہیں دیے جن کا موقع بعد کے دور میں حاصل ہوا ہے۔ قدیم تاریخ اور جدید تاریخ کے اس پہلو کا علم نہایت ایمان افروز بھی ہے اور قرآنی

دلائل کو سمجھنے کے لیے نہایت اہم بھی۔

(5)اس سلسلے میں آخری چیز جو قرآن کے مطالعہ کے لیے مدگار علم کی حیثیت رکھتی ہے، وہ بنی اسرائیل کی مذہبی کتابوں کا مطالعہ ہے جن کا قرآن میں بار بار ذکر آیا ہے۔ قرآن کے مطالعہ کے سلسلے میں صحفِ بنی اسرائیل کا مطالعہ کرنا، گویا ایک آسمانی کتاب کو سمجھنے کے لیے دوسری آسمانی کتاب سے مدد لینا ہے۔اس کے یہ معنٰی نہیں ہیں کہ ہم کتبِ سابقہ کو بطورِ معیار تسلیم کر رہے ہیں، یہ کتابیں کبھی معیار نہیں بن سکتیں۔اس سے قطع نظر کہ ان میں تحریف ہو چکی ہے اور وہ اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہی ہیں۔ یہ واقعہ کہ قرآن آسمان سے اترنے والی آخری کتاب ہے اور بقیہ تمام کتابیں اس سے پہلے کی ہیں۔ صرف یہ حقیقت اس کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ قرآن ہی کو معیار ہونا چاہیے۔ کسی بادشاہ کا آخری فرمان اس کے سابقہ فرامین کا ناسخ ہوتا ہے، نہ کہ سابقہ فرامین اس کے آخری فرمان کی تنسیخ کرتے ہیں۔ جو شخص آخری فرمان کو چھوڑ کر سابقہ فرمان کی پیروی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ بھی تو مالک کی طرف سے آیا ہے وہ قطعی طور پر نفس پرستی میں مبتلا ہے، وہ اپنی رائے کی پرستش کر رہا ہے، نہ کہ صاحب فرمان کے حکم کی۔اس لیے قرآن خدا کی مرضی معلوم کرنے کے لیے آخری سند کی حیثیت رکھتا ہے۔بقیہ کتابوں سے ہم قرآن کا حقیقی مفہوم سمجھنے میں مدد لے سکتے ہیں، مگر ان کو حجت نہیں بنا سکتے۔

مدد لینے کی دو صورتیں ہیں۔ایک تو زبان اور اسلوب بیان کے اعتبار سے۔ دوسرے تعلیمات کے اعتبار سے۔ یہ معلوم ہے کہ انجیل اور تورات کی اصل زبان عبرانی ہے اور عربی اور عبرانی دونوں ایک ہی اصل سے نکلی ہیں۔اس لیے قدرتی طور پر دونوں زبانوں میں کافی

مشابہت ہے اور ایک زبان دوسری زبان کے سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ پھر آسمانی کتابوں کا ایک خاص انداز بیان ہے۔ اس طرح کتب مقدسہ کا مطالعہ اس مخصوص طرزِ بیان سے ہم کو واقف کراتا ہے اور اس کی بلاغت کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے جو آسمانی کتابوں کا ہمیشہ سے رہا ہے۔ چنانچہ مفسّرین نے قرآن کے بہت سے الفاظ اور بیانات کا مطلب سمجھنے میں کتب سابقہ سے مدد لی ہے اور نہایت مفید معانی تک رسائی حاصل کی ہے۔

دوسری چیز تعلیمات ہیں۔ اگر تفصیل اور ضروریاتِ زمانہ کے لحاظ سے جزئی فرق کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ ایک واقعہ ہے جو پچھلی کتابوں میں بھی وہی تمام باتیں خدا کی طرف سے نازل کی گئی تھیں جو قرآن کے ذریعے ہم تک بھیجی گئیں ہیں۔ اس لیے اپنی اصلی حقیقت کے اعتبار سے دونوں ایک دوسرے کی تائید کرنے والے ہیں، نہ کہ اختلاف کرنے والے۔ کتب سابقہ کی یہی وہ حیثیت ہے جس کی بنا پر وہ مطالعہ قرآن کے لیے ایک مفید ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں، جس طرح قرآن میں ایک ہی مضمون کو مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے۔ اور اس طرح کی کسی ایک آیت کو سمجھنے کے لیے اسی قسم کی دوسری آیت سے مدد ملتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح خدا کا کلام جو بعد زمانے میں قرآن کی شکل میں آیا ہے، وہ اس سے پہلے بنی اسرائیل کے انبیاء پر مختلف شکلوں میں نازل ہوتا رہا ہے۔ اس لیے سابقہ کتب میں خدا کا جو کلام ہے وہ اس کے بعد کے کلام کو سمجھنے میں ایک مددگار کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ قرآن کے مطالعہ کے سلسلہ میں مددگار علوم کا ایک مختصر ذکر ہے۔ آخر میں اسی بات کو میں پھر دہراؤں گا جس کو میں شروع میں کہہ چکا ہوں۔ یعنی یہ کہ ان سب سے

بڑھ کر جو چیز قرآن سے استفادہ یا فہم قرآن کے لیے ضروری ہے وہ انسان کا اپنا ارادہ ہے۔بقیہ علوم قرآن کو سمجھنے میں مدد دے سکتے ہیں مگر قرآن کو جذب کرنے کے لیے کسی خارجی علم کی ضرورت نہیں ۔انسان کا اپنا جذبہ طلب ہی وہ چیز ہے جس کے ذریعے وہ قرآن کو جذب کرتا ہے۔قرآن کتابِ ہدایت ہے۔کسی کے ذہن میں قرآن کا اتر جانا دوسرے لفظوں میں یہ معنٰی رکھتا ہے کہ اس شخص کو ہدایت حاصل ہو گئی۔اس کو خیر وشر کے دوراستوں میں سے اس راستہ کو اختیار کرنے کی توفیق ملی جو اس کی زندگی کو کامیابی کی طرف لے جانے والا ہے۔اور ہدایت کا ملنا نہ ملنا تمام تر آدمی کے اپنے ارادے پر منحصر ہے۔ہدایت دینے والا خدا ہے۔اس کے سوا کہیں اور سے آدمی ہدایت حاصل نہیں کر سکتا۔مگر خدا کی طرف سے ہدایت اسی کو ملتی ہے جو اس کا طالب ہو۔اس لیے قرآن کا مطالعہ اسی کے لیے مفید ثابت ہوتا ہے اور کسی ایسے ہی شخص کو یہ توفیق ملتی ہے کہ قرآن اس کی زندگی میں داخل ہو جائے جس کو حقیقت کی تلاش ہو، جو واقعی صحیح معنوں میں ہدایت کی طلب رکھتا ہو۔جو اپنے اندر یہ عزم پیدا کر چکا ہو کہ حق اس کو جہاں اور جس شکل میں بھی ملے گا وہ اس کو لے لے گا اور اس سے چمٹ جائے گا۔قرآن کا علم کسی درس گاہ کی سند کے طور پر آدمی کو نہیں ملتا، نہ کتب خانوں اور لائبریری کی الماریوں سے اس کو ذہن میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔یہ اسی کو ملتا ہے جو حقیقی معنوں میں قرآن کا طالب ہو، جس کے اندر اتنا حوصلہ ہو کہ ہر ذاتی رجحان کے مقابلہ میں حق کو ترجیح دے سکے، جو قرآن کو کتاب الٰہی سمجھ کر اس کا مطالعہ کرے،اور اس کے مقابلے میں اپنی وہ حیثیت قرار دے جو ایک بندے کی اپنے مالک کے فرمان کے مقابلے میں ہوتی ہے۔جب بندہ اپنے آپ کو خالی

الذہن کر کے اپنے آپ کو قرآن کا مخاطب بناتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اور قرآن کے مطالب اس کے ذہن میں اترتے چلے جاتے ہیں، جیسے سوکھی زمین میں بارش ہو اور بوند بوند کر کے اس میں جذب ہوتی چلی جائے۔(1379ھ)

دوسرا حصّہ

حفاظتِ قرآن

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ (15:9)

ہم نے قرآن کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

حفاظتِ قرآن

قرآن 23 سال کے عرصہ میں اترا۔ سب سے پہلی آیت جو اتری وہ آیت علم تھی: اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِىۡ خَلَقَ (96:1)۔ یعنی، پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ اور آخری آیت آیتِ آخرت: وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا تُرۡجَعُوۡنَ فِيۡهِ اِلَى اللّٰه (2:281)۔ یعنی، اور اس دن سے ڈرو جس دن تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

ابتدائی 23 سال تک خود رسول اللہ کی ذات قرآن کے اخذ کا ذریعہ تھی۔ اپنے بعد آپ نے کچھ لوگوں کو نامزد کر دیا کہ ان سے تم قرآن سیکھنا۔ یہ لوگ وہ تھے جنھوں نے نہایت صحت کے ساتھ پورے قرآن کو اپنے سینے میں محفوظ کر لیا تھا اور عربی زبان سے گہری واقفیت اور جناب رسول کی مسلسل صحبت کی وجہ سے اس قابل ہو گئے تھے کہ مستند طور پر قرآن کی تعلیم دے سکیں۔ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق کے زمانے میں ایک شخص کوفہ سے مدینہ آیا۔ گفتگو کے دوران اس نے آپ سے کہا کہ کوفہ میں ایک شخص یاد سے قرآن پڑھاتا ہے۔ یہ سن کر حضرت عمر غضب ناک ہو گئے۔ مگر جب معلوم ہوا کہ وہ بزرگ حضرت عبد اللہ بن مسعود ہیں، تو آپ خاموش ہو گئے۔ (الاستیعاب، جلد 1، صفحہ 377) اس کی وجہ یہی تھی کہ عبد اللہ بن مسعود آنحضرت کے اجازت یافتہ تھے۔ آپ کے مجاز قاریوں میں سے چند نمایاں افراد تھے — عثمان، علی، ابی ابن کعب، زید بن ثابت، ابن مسعود، ابوالدرداء، ابو موسیٰ اشعری، سالم مولیٰ ابی حذیفہ۔

مگر یہ اجازت یافتہ افراد ہمیشہ نہیں رہ سکتے تھے۔ یہ اندیشہ بہر حال تھا کہ کسی وقت

ایسے تمام لوگ ختم ہو جائیں اور قرآن دوسرے لوگوں کے ہاتھوں میں جا کر اختلاف کا شکار ہو جائے۔ جنگ یمامہ (12ھ) کے بارے میں خبر آئی کہ کثرت سے مسلمان قتل ہو گئے ہیں۔ حضرت عمر، خلیفہ اول ابو بکر صدیق کے پاس آئے اور کہا کہ اب قرآن کی حفاظت کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ اس کو تحریری طور پر باضابطہ مدون کر دیا جائے۔ اس موقع پر روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں:

فَلَمَّا قُتِلَ سَالِمٌ مَوْلَى أَبِي حُذَيْفَةَ خَشِيَ عُمَرُ أَنْ يَذْهَبَ الْقُرْآنُ، فَجَاءَ إِلَى أَبِي بَكْرٍ...(المشیخۃ البغدادیۃ للاموی: 23)۔ جب سالم، مولیٰ ابوحذیفہ قتل ہوئے تو عمر کو خطرہ پیدا ہوا کہ قرآن ضائع نہ ہو جائے، وہ ابو بکر کے پاس آئے۔

یمامہ کی جنگ میں تقریباً 700 صحابہ قتل ہوئے تھے۔ مگر حضرت عمر کو "ذِہاب قرآن" (قرآن کے ضائع ہونے) کا خطرہ حضرت سالم کی موت کی وجہ سے ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان چند مخصوص صحابہ میں سے تھے جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم قرآن کی اجازت دی تھی۔

جیسا کہ ثابت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے اترتے ہی اس کو فوراً لکھوا دیا کرتے تھے۔ کتابت کا اہتمام اتنا زیادہ تھا کہ سورہ النساء، آیت 95 اتر چکی تھی، بعد کو غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ (جن کو کوئی عذر نہیں) اس میں بطور اضافہ اترا۔ امام مالک کے الفاظ میں یہ "حرف واحد" (تاریخ دمشق لابن عساکر، جلد 36، صفحہ 312) بھی آپ نے اسی وقت کاتب کو بلا کر لکھوایا:

لما نزلت {لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ من الْمُؤْمِنِينَ} قَالَ النَّبِي صلى الله عليه وسلم: ادْع زيدا فجَاء وَمَعَهُ الدواة واللوح والكتف فَقَالَ: اكْتُبْ لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ من الْمُؤْمِنِينَ غير أولى الضَّرَر وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيل الله ... (صحیح البخاری ،حدیث نمبر 4990)۔ جب آیت لایستوی القاعدون الخ اتری تو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زید کو بلاؤ اور وہ تختی اور قلم اور کتف اور دوات لے کر آئیں۔ جب وہ آگئے تو کہا کہ لکھو لایستوی (برابر نہیں ہو سکتے بیٹھے رہنے والے اہل ایمان جن کو کوئی عذر نہیں اور وہ اہل ایمان جو اللہ کی راہ میں لڑنے والے ہیں) . . .

آپ کا معمول تھا کہ نازل شدہ آیات کو لکھانے کے بعد اس کو پڑھوا کر سنتے تھے۔زید بن ثابت کا بیان ہے: فَإِنْ كَانَ فِيهِ سَقْطٌ أقَامَهُ،ثُمَّ أَخْرُجُ بِهِ إِلَى النَّاسِ (المعجم الاوسط للطبرانی، حدیث نمبر 1913)۔ اگر کوئی جزء لکھنے سے چھوٹ جاتا تو اس کو درست کراتے۔ جب یہ سارا کام پورا ہو جاتا تب اشاعت عام کا حکم دیا جاتا۔

کاتبان وحی (وہ صحابہ جن سے آپ قرآن کو لکھواتے تھے) ان کی تعداد 42 تک شمار کی گئی ہے۔(ان 42 کاتبوں کے نام کے لیے ملاحظہ جو الکتانی کی کتاب التراتیب الاداریہ، جلد 1، صفحہ 16۔ مطبوعہ مراکش)۔ابن عبد البر نے عقد الفرید (جلد 4، صفحہ 114) میں لکھا ہے کہ حنظلہ ابن ربیع تمام کاتبوں کے "خلیفہ" تھے۔یعنی ان کو حکم تھا کہ وہ ہر وقت آپ کی صحبت میں موجود رہیں۔آپ کے اس اہتمام کا نتیجہ یہ تھا کہ جب آپ کی وفات ہوئی تو کثرت سے لوگوں کے پاس قرآن کے اجزاء لکھے ہوئے موجود تھے۔ایک

تعداد ان لوگوں کی تھی جن کے پاس مکمل قرآن اپنی اصل ترتیب کے ساتھ جمع شدہ موجود تھا، ان میں سے چار خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں:

مَاتَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم وَلَمْ يَجْمَعِ الْقُرْآنَ غَيْرُ أَرْبَعَةٍ: أَبُو الدَّرْدَاءِ، وَمُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ، وَزَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ، وَأَبُو زَيْدٍ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4718)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو چار آدمیوں کے پاس مکمل قرآن تحریری طور پر موجود تھا: ابوالدرداء، معاذ بن جبل، زید بن ثابت اور ابو زید۔

قرآن مکمل طور پر لکھا ہوا عہد نبوت میں موجود تھا۔ البتہ کتابی شکل میں ایک جگہ مجلد نہیں ہوا تھا۔ قسطلانی شارح بخاری کے حوالہ سے الکتانی نے نقل کیا ہے:

وقد كان القرآن كله مكتوبًا في عهده صلى الله عليه وسلم لكنه غير مجموع في موضع واحد (التراتیب الاداریہ للکتانی، جلد 2، صفحہ 384)۔ قرآن کل کا کل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہی لکھا جا چکا تھا۔ البتہ ایک جگہ تمام سورتوں کو جمع نہیں کیا گیا تھا۔

حارث محاسبی نے، جو امام حنبل کے معاصر ہیں۔ اپنی کتاب فہم السنن میں لکھا ہے:

و كان الْقُرْآنُ مُنْتَشِرًا فَجَمَعَهَا جَامِعٌ وَرَبَطَهَا بِخَيْطٍ (الاتقان فی علوم القرآن، جلد 1، صفحہ 207)۔ قرآن کی سورتیں اس میں الگ الگ لکھی ہوئی تھیں۔ ابو بکر کے حکم سے جامع (زید بن ثابث) نے ایک جگہ سب سورتوں کو جمع کیا اور ایک دھاگہ سے سب کی شیرازہ بندی کی۔

قرآن کی کتابت تین مراحل سے گزری ہے — کتابت، تالیف، جمع۔

پہلے مرحلہ میں کوئی آیت یا سورہ اترتے ہی اس کو کسی ٹکڑے پر لکھ لیا جاتا تھا، اس سلسلے میں حسب ذیل چیزوں کے نام آئے ہیں:

رقاع: چمڑا

لخاف: پتھر کی سفید پتلی تختیاں (سلیٹ)

کتف: اونٹ کے مونڈھے کی گول ہڈی

عسیب: کھجور کی شاخ کی جڑ کا کشادہ حصہ

دوسرے مرحلے کے عمل کو حدیث میں تالیف سے تعبیر کیا گیا ہے حضرت زید بن ثابت کہتے ہیں: كنَّا عند رسول الله صلى الله عليه وسلم نُؤلِّفُ القرآن من الرِّقَاع (مسند احمد، حدیث نمبر 21607)۔ ہم لوگ رقاع پر قرآن تالیف کرتے تھے۔ گویا اوّلاً ہر آیت نازل ہوتے ہی لکھ لی جاتی تھی۔ پھر جب سورہ مکمل ہو جاتی تو پوری سورہ کو مرتب شکل میں رقاع (چمڑے) پر لکھتے تھے۔ اس قسم کے مولّفہ قرآن (مکمل یا غیر مکمل) دورِ نبوت ہی میں کثرت سے لوگوں کے پاس ہو چکے تھے۔ حضرت عمر اسلام لانے کے مشہور واقعہ میں ہے کہ بہن کو زد و کوب کرنے کے بعد آپ نے کہا وہ کتاب مجھے دکھاؤ جو ابھی تم پڑھ رہے تھے (أَعْطِينِي هَذِهِ الصَّحِيفَةَ الَّتِي سَمِعْتُكُمْ تَقْرَءُونَ آنِفًا)۔ بہن نے جواب دیا ناپاکی کے ساتھ تم اس کو چھو نہیں سکتے۔ پھر آپ نے غسل کیا اور ان کی بہن نے کتاب انھیں دی: فَاغْتَسَلَ، فَأَعْطَتْهُ الصحيفةَ (سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 296)۔

تیسرے مرحلہ کے کام کو "جمع" سے تعبیر کیا گیا ہے۔یعنی پورے قرآن کو ایک جلد میں یکجائی طور پر لکھنا۔رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآن مختلف رسالوں اور کتابوں کی شکل میں ہوتا تھا۔یہ تمام سورتوں کو ایک ہی تقطیع اور سائز کے اوراق پر لکھوا کر ایک ہی جلد میں مجلد کرنے کا طریقہ آپ کے عہد میں رائج نہ تھا۔بخاری کی ایک روایت کے مطابق صرف چار صحابہ،ابی بن کعب، معاذ بن جبل،ابو زید،زید بن ثابت تھے، جنھوں نے پورے قرآن کو آپ کے عہد میں مجموعی شکل میں تیار کر لیا تھا(صحیح البخاری، حدیث نمبر 3810)۔تاہم ان کی حیثیت نجی مجموعوں کی تھی۔محمد بن کعب القرظی کے حوالہ سے ابن سعد نے جو روایت نقل کی ہے،اس کے مطابق ایسے جامعین قرآن کی تعداد پانچ تھی: جَمَعَ الْقُرْآنَ فِي زَمَنِ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم خَمْسَةٌ مِنْ الْأَنْصَارِ (طبقات ابن سعد، جلد2، صفحہ 307)۔

حضرت ابو بکر صدیق نے جو کام کیا وہ یہی تھا کہ انھوں نے ریاستی انتظام کے تحت تمام سورتوں کو ایک ہی تقطیع اور سائز پر لکھوا کر مجلد کرادیا۔امام مالک شہاب زہری سے اور شہاب زہری عبد اللہ بن عمر کے صاحبزادہ سالم کے حوالے سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ زید بن ثابت نے القراطیس پر ابو بکر کے حکم سے قرآن کی کل سورتوں کو لکھا تھا (المصاحف لابن ابی داود، صفحہ 57)۔بعض محققین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ایک ہی تقطیع کے اوراق جب بنائے جاتے تھے تو ان کو قراطیس کہتے تھے۔ایک سائز کے اوراق پر لکھے ہونے کی وجہ سے ابو بکر الصدیق کی حکومت کے مرتب کردہ اس نسخہ کو رَبعہ کہتے تھے(الاتقان، جلد1، صفحہ 85-84)۔ربعہ کا ترجمہ چو کھنٹا کیا جا سکتا ہے۔اس سے

معلوم ہوتا ہے کہ ان اوراق کا طول و عرض غالباً متساوی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عمر فاروق کے زمانے میں مصر، عراق، شام اور یمن وغیرہ میں قرآن کے ایک لاکھ سے زیادہ نسخے موجود تھے۔

بعد کے زمانے میں لکھا ہوا قرآن ہی لوگوں کے لیے قرآن کو سیکھنے کا ذریعہ بن سکتا تھا، تاہم ایک خطرہ اب بھی تھا۔ مقدس کتاب میں انتہائی معمولی فرق بھی زبردست اختلاف کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لیے یہ اندیشہ تھا کہ مختلف لوگ اگر اپنے اپنے طور پر قرآن لکھیں تو کتابت اور قرأت کا فرق مسلمانوں کے اندر زبردست اختلاف کھڑا کر دے گا اور اس کو ختم کرنے کی کوئی سبیل باقی نہ رہے گی۔ مثلاً سورۃ فاتحہ میں ایک ہی لفظ کو محض ادائیگی کے فرق سے کوئی مالک یوم الدین لکھتا، کوئی مَلِکِ یَومِ الدین اور کوئی ملیک یوم الدین۔ پھر جیسے جیسے زمانہ گزرتا، طرز تحریر اور رسم الخط کا فرق نئے نئے اختلاف پیدا کرتا چلا جاتا۔ اس لیے حضرت عمر کے مشورے سے خلیفہ اول حضرت ابو بکر نے طے کیا کہ سرکاری اہتمام میں قرآن کا ایک مستند نسخہ لکھوا دیا جائے اور اختلاف قرأت کے امکان کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔

اس کے لیے زید بن ثابت سب سے زیادہ موزوں شخص تھے، کیونکہ وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب (سیکریٹری) تھے۔ زید اور ابی بن کعب دونوں "عرضۂ اخیرہ" میں شامل تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست پورے قرآن کو نبوی ترتیب کے ساتھ سنا تھا۔ ان کو پورا قرآن مکمل طور پر یاد تھا اور اس کے ساتھ پورا قرآن مرتب طور پر لکھا ہوا بھی ان کے پاس موجود تھا۔ خلیفہ اول نے ان کو حکم دیا کہ تم قرآن کا تتبع کرو اور اس کو جمع

کردو: فَتَتَبَّعِ الْقُرْآنَ فَاجْمَعْهُ(صحیح البخاری، حدیث نمبر 4679)۔اس بات کے طے ہونے کے بعد حضرت عمر نے مسجد میں اعلان کر دیا کہ جس کے پاس قرآن کا کوئی ٹکڑا موجود ہو، وہ لے آئے اور زید کے سامنے پیش کرے۔

خلیفہ اول کے زمانہ میں قرآن "کاغذ" یعنی چمڑے، پتھر اور کھجور کی چھال وغیرہ پر لکھا ہوا تو موجود تھا، اور بہت سے لوگوں کے سینوں میں، رسول اللہ سے سن کر، مرتب طور پر بھی محفوظ تھا۔ مگر وہ ایک کتاب کی طرح بین الدفتین اب تک جمع نہیں ہوا تھا۔ خلیفہ اول نے حکم دیا کہ اس کو بین الدفتین جمع کردو اور اس کو ایک مجلد کتاب کی صورت میں یکجا کردو:

وَقَالَ الْحَارِثُ الْمُحَاسَبِيُّ فِي كِتَابِ فَهْمِ السُّنَنِ: كِتَابَةُ الْقُرْآنِ لَيْسَتْ بِمُحْدَثَةٍ فَإِنَّهُ صلى الله عليه وسلم كَانَ يَأْمُرُ بِكِتَابَتِهِ وَلَكِنَّهُ كَانَ مُفَرَّقًا فِي الرِّقَاعِ وَالْأَكْتَافِ وَالْعُسُبِ فَإِنَّمَا أَمَرَ الصِّدِيقِ بِنَسْخِهَا مِنْ مَكَانٍ إِلَى مَكَانٍ مُجْتَمِعًا وَكَانَ ذَلِكَ بِمَنْزِلَةِ أَوْرَاقٍ وُجِدَتْ فِي بَيْتِ رَسُولِ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم فِيهَا القرآن مُنْتَشِرٌ فَجَمَعَهَا جَامِعٌ وَرَبَطَهَا بِخَيْطٍ حَتَّى لَا يَضِيعَ مِنْهَا شَيْءٌ (الاتقان فی علوم القرآن، جلد 1، صفحہ 40)۔ حارث محاسبی فہم السنن میں لکھتے ہیں کہ قرآن کی کتابت کوئی نئی بات نہ تھی، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کو لکھوایا کرتے تھے۔ مگر وہ رقاع اور اکتاف اور عسیب میں متفرق طور پر لکھا ہوا تھا۔ ابو بکر صدیق نے اس کو مرتب طور پر یکجا لکھنے کا حکم دیا۔ اور یہ بمنزلہ ان اوراق کے تھا جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر

میں پائے گئے تھے۔ ان میں قرآن منتشر طور پر لکھا ہوا تھا۔اسی کو جمع کرنے والے جمع کر دیااور ایک دھاگے میں اس طرح پرو دیا کہ اس کا کوئی حصہ ضائع نہ ہو۔

عہد صدیقی میں جمع قرآن کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس سے پہلے قرآن "جمع" نہ تھااور آپ کے زمانہ خلافت میں اس کو جمع کیا گیا۔قرآن اس سے پہلے بھی مکمل طور پر جمع تھا۔ "عرضۂ اخیرہ" میں متعدد صحابہ کو شامل کرکے آپ نے اس کی تصدیق و توثیق بھی فرمادی تھی۔ جمع قرآن کا یہ اہتمام صرف اس لیے ہوا کہ معمولی امکانی فروق کو بھی باقی نہ رہنے دیا جائے جو حافظہ یا کتابت میں فرق کی وجہ سے ہو سکتے تھے۔مثال کے طور پر حضرت عمر نے زید بن ثابت کو یہ آیت سنائی:

مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ (9:100)

زید نے کہا مجھے تو یہ آیت جس طرح یاد ہے، اس میں الانصار اور الذین کے درمیان ایک "واو" بھی ہے۔ چنانچہ تحقیق شروع ہوئی بالآخر مختلف لوگوں کی گواہیوں سے ثابت ہوا کہ زید کی رائے صحیح تھی۔ چنانچہ مصحف میں آیت کو "واو" کے ساتھ لکھا گیا (فضائل القرآن للقاسم بن سلام، صفحہ 310)۔

وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ (9:100)۔اور مہاجرین وانصار میں جو لوگ سابق اور مقدم ہیں اور جنھوں نے خوبی کے ساتھ ان کی پیروی کی۔

مولانا بحرالعلوم شرح سلم میں لکھتے ہیں "قرآن کی یہ ترتیب جس پر وہ آج ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ اس لیے کہ ان دس قاریوں نے جن کی قرأت اسلامی دنیا میں بالاتفاق مقبول ہے، صحیح سندوں سے جس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے، قرآن کو اسی ترتیب سے نقل کیا"۔

زید بن ثابت نے جب پورا قرآن مرتب کر لیا تو ان کے مصحف کے علاوہ جتنے مختلف اجزاء اکٹھا ہوئے تھے، ان سب کو جلا کر ختم کر دیا گیا۔ یہ مجلد مصحف خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق کے پاس رکھ دیا گیا۔ آپ کی وفات کے بعد وہ خلیفہ ثانی حضرت عمر کے پاس رہا۔ پھر آپ کی وفات کے بعد وہ حفصہ بنت عمرؓ کے پاس محفوظ رہا۔

حضرت عثمان کی خلافت کا زمانہ آیا تو اسلام بہت پھیل چکا تھا اور مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ اس وقت مختلف علاقوں کے مسلمانوں کے لیے قرآن سیکھنے کا ذریعہ وہ صحابہ تھے جو مدینہ سے نکل کر ممالک اسلامیہ میں ہر طرف پھیل گئے تھے۔ مثلاً اہل شام ابی بن کعب سے قرآن سیکھتے تھے۔ اہلِ کوفہ عبد اللہ بن مسعود سے اہل عراق ابو موسیٰ اشعری سے۔ تاہم اختلاف لہجہ اور اختلاف کتابت کی وجہ سے دوبارہ لوگوں میں قرآن کے بارے میں اختلافات ہونے لگے حتیٰ کہ ایک دوسرے کو کافر کہنے لگے: حتی کَفَّرَ بعضهم بعضًا (فتح الباری لابن حجر العسقلانی، جلد 9، صفحہ 18)۔ ابن ابی داؤد نے کتاب المصاحف میں یزید بن معاویہ نخعی سے نقل کیا ہے کہ ولید بن عقبہ کے زمانہ میں ایک بار وہ کوفہ کی مسجد میں تھے۔ حذیفہ بن الیمان بھی اس وقت مسجد میں موجود تھے۔ مسجد میں ایک حلقہ قرآن کے ذکر میں مشغول تھا۔ ایک شخص نے کوئی آیت پڑھی اور کہا قرأۃ ابی موسیٰ الاشعری۔ حضرت حذیفہ یہ سن کر غضب ناک ہو گئے۔ انھوں نے

کھڑے ہو کر ایک مختصر تقریر کی اور فرمایا:

هَكَذَا كَانَ مَنْ قَبْلَكُمْ اخْتَلَفُوا، وَاللَّهِ لَأَرْكَبَنَّ إِلَى أَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ (فتح الباری لابن حجر، جلد 9، صفحہ 18)۔ تم سے پہلے جو لوگ تھے، انھوں نے اسی طرح اختلاف کیا، خدا کی قسم میں سوار ہو کر امیر المومنین (عثمان) کے پاس جاؤں گا۔

عمارہ بن غزیہ کی روایت کے مطابق حذیفہ بن الیمان واپس آئے۔ وہ ایک فوجی افسر تھے اور اس وقت آرمینیہ میں اہل شام سے اور آذربائیجان میں اہل عراق سے جنگ کر کے لوٹے تھے۔ وہ مدینہ پہنچے تو اپنے مکان جانے کے بجائے سیدھے خلیفہ ثالث کے پاس آئے اور کہا:

يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ، أَدْرِكْ هَذِهِ الْأُمَّةَ قَبْلَ أَنْ يَخْتَلِفُوا فِي الْكِتَابِ، اخْتِلَافَ الْيَهُودِ وَالنَّصَارَى (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4702)۔ اے امیر المومنین لوگوں کو سنبھالیے، قبل اس کے کہ لوگ کتاب اللہ کے بارے میں اختلاف میں پڑ جائیں جس طرح یہود و نصاری اختلاف میں پڑ گئے۔

حضرت عثمان کے زمانے میں ایسی آبادیاں اسلام میں داخل ہو گئیں جن کی مادری زبان عربی نہ تھی۔ عربی الفاظ و حروف کے صحیح تلفظ کی قدرت ظاہر ہے ان میں نہیں ہو سکتی تھی۔ خود عرب کے مختلف قبائل کے لہجے الگ الگ تھے۔ اس سے قرأت قرآن میں اختلاف پیدا ہوا۔ نتیجتاً نقل و تحریر میں بھی اختلاف شروع ہو گیا۔ ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ قبیلہ بنی ہذیل "حتیٰ" کو "عتیٰ" پڑھتا تھا۔ ابن مسعود اسی قبیلے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے "حتیٰ

حین "کو" عتیٰ عین "پڑھتے تھے۔ قبیلہ بنو اسد "تَعلَمون" کی "ت" کو زیر کے ساتھ (تِعلَمُون) پڑھتا تھا۔ مدینہ کے لوگ "تابوت" کا تلفظ "تابوہ" کرتے تھے۔ قبیلہ قیس "ک" تانیث کا تلفظ "ش" سے کرتے تھے اور قرآنی آیت "قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا" کو "جعلَ رَبُّشِ تحتشِ سريًّا" پڑھتے۔ اسی طرح قبیلہ تمیم "اَن" کے لفظ کو "عن" کی شکل میں ادا کرتے تھے اور "عَسَى اللَّهُ عن يأتي" پڑھتے تھے۔ ایک قبیلہ "س" کو "ت" کی شکل میں ادا کرتا تھا اور " أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاتِ. مَلِكِ النَّاتِ. إِلٰهِ النَّاتِ" پڑھتا تھا، وغیرہ۔

ان حالات میں حذیفہ بن یمان صحابی کے مشورہ سے حضرت عثمان نے صدیقی نسخہ کی نقلیں تیار کرائیں اور تمام شہروں میں اس کا ایک ایک نسخہ بھیج دیا۔ یہ کام دوبارہ حضرت زید بن ثابت انصاری کی سرکردگی میں کرایا گیا اور ان کی مدد کے لیے گیارہ افراد مقرر کیے گئے۔ خلیفہ سوم کے حکم کے مطابق اس کمیٹی نے قرآن کو قریش کے لہجہ پر تحریر کیا جو کہ پیغمبر اسلام کا لہجہ تھا۔ اس کے بعد آپ نے حکم دیا کہ دوسرے نسخے جو لوگوں نے بطور خود لکھے ہیں وہ ان کو حکومت کے حوالے کردیں۔ چنانچہ ان کو جمع کرکے نذر آتش کردیا گیا۔

اس طرح قرآن کو لکھاوٹ یعنی نوشت وکتابت کی حد تک ایک بنادیا گیا۔ تاہم فطری اختلاف کی وجہ سے سارے لوگ ایک طرح قرآن کو پڑھنے پر قادر نہ ہو سکتے تھے۔ اس لیے لوگوں کو آزادی دے دی گئی کہ، سات طریقوں یعنی متعدد لب ولہجہ میں پڑھ سکتے ہیں۔ صدیق اکبر کا جمع قرآن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ایک سال بعد

انجام پایا تھا، عثمانی مصحف کی ترتیب آپ کی وفات کے پندرہ سال بعد ہوئی۔

تیسری صدی کے مشہور صوفی اور عالم حارث محاسبی کا قول اتقان میں سیوطی نے نقل کیا ہے:

وَقَالَ الْحَارِثُ الْمُحَاسَبِيُّ: الْمَشْهُورُ عِنْدَ النَّاسِ أَنَّ جَامِعَ الْقُرْآنِ عُثْمَانَ وَلَيْسَ كَذَلِكَ إِنَّمَا حَمَلَ عُثْمَانُ النَّاسَ عَلَى الْقِرَاءَةِ بِوَجْهٍ وَاحِدٍ (الِاتقان فی علوم القرآن، جلد 1، صفحہ 211)۔ لوگوں میں مشہور ہے کہ حضرت عثمان جامع قرآن ہیں، حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ انھوں نے صرف یہ کیا کہ لوگوں کو قرآن کی ایک قرأت پر جمع کر دیا۔

بعض لوگوں نے تفنّن طبع یا عناد کے طور پر اس قسم کی باتیں مشہور کیں کہ حضرت عثمان نے قرآن میں تحریفات کر ڈالیں۔ مثلاً قرآنی آیت وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ (37:24) کے آخر میں عن ولایۃ علی کے الفاظ تھے، جنھیں عہد عثمانی میں بالقصد قرآن سے خارج کر دیا گیا۔ حتیٰ کی کچھ لوگوں نے مضحکہ خیز بات مشہور کی کہ "ولایت" کے نام سے ایک مستقل سورہ قرآن میں تھی، جس میں اہل بیت کے اسماء اور ان کے حقوق وغیرہ کا تفصیلی ذکر تھا۔ اس کو قرآن سے نکال دیا گیا، اس قسم کی باتیں قطعاً بے بنیاد ہیں۔ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ (75:17) شیعہ و سنی دونوں کے نزدیک بالاتفاق قرآن کی آیت ہے۔ پھر قرآن کو خدا کی کتاب مانتے ہوئے کیسے کوئی شخص اس قسم کی بے بنیاد باتوں کو مان سکتا

ہے۔ مشہور شیعی عالم علامہ طبرسی نے لکھاہے:

فَأَمَّا الزِّيَادَةُ فِيهِ فَمُجْمَعٌ عَلَى بُطْلَانِهِ، وَأَمَّا النُّقْصَانُ مِنْهُ فَقَدْ رَوَى جَمَاعَةٌ مِنْ أَصْحَابِنَا وَقَوْمٌ مِنْ حَشْوِيَّةِ الْعَامَّةِ أَنَّ فِي الْقُرْآنِ تَغْيِيرًا وَنُقْصَانًا، وَالصَّحِيحُ مِنْ مَذْهَبِ أَصْحَابِنَا خِلَافُهُ (تفسیر الطبرسی، جلد 1، صفحہ 43-42)۔ قرآن میں اضافہ (شیعہ و سنی دونوں کے) اجماع سے غلط ہے۔ باقی کمی تو بعض شیعوں سے اور عامہ کے حشویہ (یعنی اہل سنت کے محدثین) سے اس کا دعویٰ منقول ہے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ یہ بھی غلط ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کبھی بھی محققین نے اس قسم کے دعوے نہیں کیے۔ یہ موقع پرستوں کے شوشے تھے جو انھوں نے سیاسی مقصد کے لیے وضع کیے۔ اہل بیت کی فضیلت کی ساری موضوعات اس لیے گھڑی گئیں تاکہ ان کے لیے خلافت کا استحقاق ثابت ہو جائے۔ مثلاً ایک غیر معروف شخص محمد بن جہم الہلالی تھے۔ انھوں نے امام جعفر صادق کی طرف منسوب کرکے یہ مشہور کیا کہ قرآنی آیت اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ (16:92) میں تحریف کی گئی ہے۔ اصل الفاظ تھے: أَئِمَّةٌ هِيَ أَزْكَى مِنْ أَئِمَّتِكُمْ (الکافی للکلینی، جلد 1، صفحہ 292)۔ یعنی ہمارے بنی ہاشم کے ائمہ و حکمران بنی امیہ کے حکمرانوں سے بہتر ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا حضرت عثمان نے 25ھ میں حفصہ بنت عمر کے پاس سے مصحف صدیقی منگوایا۔ اس وقت قرآن کے کاتب اول زید بن ثابت انصاری موجود تھے۔ ان کی رہنمائی میں آپ نے بارہ آدمیوں کی جماعت مقرر کی۔ انھوں نے صدیقی نسخہ کی بنیاد پر قرآن کی سات

نقلیں تیار کیں۔ پھر یہ نسخے تمام اسلامی ملکوں میں بھیج دیے گئے۔ حضرت عثمان نے حکم دیا کہ اس کے سوا جتنے مصاحف لوگوں نے بطور خود لکھ لیے ہیں وہ سب جلا دیے جائیں (المصاحف لابن ابی داود، صفحہ 91)۔ ایک نسخہ انھوں نے دار السلطنت مدینہ میں رکھا اور اس کا نام "الامام" رکھا اور بقیہ ہر گوشۂ مملکت میں بھیج دیا (المصاحف لابن ابی داود، صفحہ 90)۔ مکہ، شام، یمن، بحرین، بصرہ، کوفہ میں سے ہر جگہ ایک ایک نسخہ بھیجا۔

یہ مصحف بعد کی صدیوں میں انتہائی صحت کے ساتھ نسل در نسل منتقل ہوتا رہا یہاں تک کہ وہ دورِ پریس میں پہنچ گیا جس کے بعد کسی ضیاع یا تغیر کا کوئی سوال نہیں۔ اس ابتدائی نسخہ کے ساتھ بعد کے نسخوں کی مطابقت کا کتنا زیادہ اہتمام کی گیا ہے، اس کی دو چھوٹی سی مثال لیجئے۔ سورہ المؤمنون (سورہ نمبر 23) کی آیت 108 میں قال (الف کے ساتھ) لکھا ہوا ہے، یہی لفظ اسی سورہ کی اگلی آیت 112 میں قٰل (بغیر الف) لکھا گیا ہے۔ گویا ابتدائی مصحف میں جو لفظ جس شکل میں لکھا ہوا تھا ٹھیک اسی طرح اس کو لکھا جاتا رہا۔ خواہ ایک ہی لفظ، دو جگہ دو املاء کے ساتھ کیوں نہ ہو۔ اسی طرح سورہ قیامہ کی آیت "و قیل من" کے بعد قاری تھوڑی دیر وقفہ کے لیے ٹھہرتا ہے۔ پھر "راق" پڑھتا ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ روایات کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر ہلکا وقف کیا تھا۔ قرآن میں اس طرح کے دوسرے متعدد مقامات ہیں، مگر کبھی قرآن پڑھنے والوں کو یہ خیال نہیں ہوا کہ بطور خود دوسرے مقامات پر بھی اسی طرح وقفہ دے کر پڑھنا شروع کر دیں۔

آج جو قرآن مسلمانوں کے درمیان رائج ہے، اس کی صحت میں کسی فرقہ کا کوئی اختلاف نہیں۔ حتٰی کہ محقق شیعہ علماء بھی اس معاملہ میں متفق ہیں۔ مشہور شیعہ عالم ابو

عبد اللہ الزنجانی (وفات 1941) نے اپنی کتاب تاریخ القرآن میں نقل کیا ہے کہ علی بن موسیٰ المعروف بابن طاؤس (664-589ھ) جو محقق شیعہ علما میں سے ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب سعد السعود میں شہرستانی سے نقل کیا ہے، جو انھوں نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں سوید بن علقمہ سے روایت کیا ہے:

عَنْ سُوَيْدِ بْنِ عَلْقَمَةَ قَالَ: سَمِعْتُ عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَقُولُ: "أَيُّهَا النَّاسُ! اللهَ اللهَ! إِيَّاكُمْ وَالْغُلُوَّ فِي أَمْرِ عُثْمَانَ وَقَوْلَكُمْ: حَرَّاقُ الْمَصَاحِفِ، فَوَاللهِ مَا حَرَّقَهَا إِلَّا عَنْ مَلَإٍ مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. جَمَعَنَا وَقَالَ: مَا تَقُولُونَ فِي هَذِهِ الْقِرَاءَةِ الَّتِي اخْتَلَفَ النَّاسُ فِيهَا، يُلْقَى الرَّجُلُ فَيَقُولُ قِرَاءَتِي خَيْرٌ مِنْ قِرَاءَتِكَ، وَهَذَا يَجُرُّ إِلَى الْكُفْرِ؟ فَقُلْنَا: مَا الرَّأْيُ؟ قَالَ: أُرِيدُ أَنْ أَجْمَعَ النَّاسَ عَلَى مُصْحَفٍ وَاحِدٍ، فَإِنَّكُمْ إِنِ اخْتَلَفْتُمُ الْيَوْمَ كَانَ مَنْ بَعْدَكُمْ أَشَدَّ اخْتِلَافًا. فَقُلْنَا: نِعْمَ مَا رَأَيْتَ.

(تاریخ القرآن لابی عبد اللہ الزنجانی، موسسہ ہنداوی، 2016، صفحہ 74)۔ وہ کہتے ہیں، میں نے حضرت علی بن ابی طالب کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ اے لوگو، اللہ اللہ، عثمان کے معاملہ میں غلو سے بچو۔ یہ نہ کہو کہ انھوں نے مصاحف کو جلایا۔ خدا کی قسم انھوں نے نہیں جلایا مگر اس وقت کہ انھوں نے صحابہ کی جماعت کو اکٹھا کیا اور پوچھا کہ تم قرآن میں اختلاف قرأت کے بارے میں کیا کہتے ہو۔ ایک شخص دوسرے سے ملتا ہے اور کہتا ہے۔ میری قرأت تمھاری قرأت سے بہتر ہے۔ اس قسم کی بات کفر تک جاتی ہے۔ صحابہ نے کہا آپ کی کیا رائے ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ تمام لوگوں کو ایک مصحف پر جمع کردوں۔ کیوں کہ تم اگر آج اختلاف میں پڑ گئے تو تمھارے بعد لوگ اور زیادہ اختلاف میں

پڑیں گے۔ تمام صحابہ نے کہاہاں آپ کی رائے سے ہم کو اتفاق ہے۔

قرآن کا یہ ایسا وصف ہے جس کا معاندین تک نے اعتراف کیا ہے۔ سر ولیم میور لکھتے ہیں:

"محمد کی وفات کے ربع صدی بعد ہی ایسے مناقشات اور فرقہ بندیاں ہو گئیں جس کے نتیجے میں عثمان قتل کر دیے گئے، اور یہ اختلافات آج بھی باقی ہیں۔ مگر ان سب فرقوں کا قرآن ایک ہی ہے (ONE Kor'an has been current amongst them)۔ ہر زمانے میں یکساں طور پر سب فرقوں کا ایک ہی قرآن پڑھنا، اس بات کا نا قابل تردید ثبوت ہے کہ آج ہمارے سامنے وہی مصحف ہے جو اس بد قسمت خلیفہ (عثمان) کے حکم سے تیار کیا گیا تھا، شاید پوری دنیا میں کوئی دوسری ایسی کتاب نہیں ہے جس کی عبارت بارہ صدیوں تک اس طرح بغیر تبدیلی کے باقی ہو:

There is probably in the world no other work which has remained twelve centuries with so pure a text. (*The Life of Mohammad from Original Sources*, Sir William Muir, Edinburgh, 1923, pp. xxii-xxiii)

لین پول نے اس حقیقت کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے:

"قرآن کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی اصلیت میں کوئی شبہ نہیں۔ ہر حرف جو ہم آج پڑھتے ہیں۔ اس پر یہ اعتماد کر سکتے ہیں کہ تقریباً تیرہ صدیوں سے غیر مبدل رہا ہے" (سلکشن فرام دی قرآن، دیباچہ)

جرمن محقق وان ہیم غیر مسلم مستشرقین کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہم قرآن کو محمد کا کلام اسی طرح یقین کرتے ہیں جس طرح مسلمان اس کو خدا کا کلام یقین کرتے ہیں" (اعجاز التنزیل صفحہ 500)

عہد عثمانی تک قرآن کے جتنے نسخے لکھے گئے وہ سب خط حیری میں تھے۔ حضرت علی کے زمانہ میں خط کی اصلاح ہوئی اور خط کوفی وجود میں آیا جو سابق خط کی ترقی یافتہ شکل تھا۔ حضرت علی کے ندیم خاص ابو الاسود الدولی (69ھ) نے پہلی بار اس خط کو بنایا اور پھر بنی امیّہ کے عہد میں اس کو مزید ترقی ہوئی۔ قرآن میں اعراب لگانے کا آغاز بھی ابوالاسود الدولی نے حضرت علی کے عہد میں کیا (اخبار النحویین البصریین للسیرافی، صفحہ 13)۔ اسی کی بنیاد پر حجاج بن یوسف نے بعد کو قرآن کے باقاعدہ معرب نسخے تیار کرائے۔ آج تک قرآن ٹھیک اسی نہج پر لکھا جارہا ہے۔

کتابِ محفوظ

ایک کاتب صاحب کو ایک کتاب کا مسوّدہ کتابت کے لیے دیا گیا۔ اس مسودہ میں ایک جگہ محدث "ابو دعاد" کا نام تھا۔ کاتب صاحب "ابو دعاد" سے واقف نہ تھے۔ البتہ وہ "ابو داؤد" کو جانتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے "ابو دعاد" کی جگہ "ابو داؤد" لکھ دیا۔ اسی طرح ایک مضمون میں ایک جگہ "ہیلی کا پٹر" کا لفظ تھا۔ کاتب صاحب اس کو سمجھ نہ سکے۔ انھوں نے اصل لفظ کی جگہ "املی کا پیڑ" لکھ دیا۔

اس قسم کی غلطیوں کی مثالیں بہت عام ہیں۔ ایک آدمی کسی مضمون کو پڑھ رہا ہے یا اس کو نقل کر رہا ہے۔ اس درمیان میں ایک ایسا جملہ آتا ہے جس کو وہ سمجھ نہیں پاتا۔ چنانچہ اس کو وہ اپنے ذہن کے مطابق بدل کر کچھ سے کچھ کر دیتا ہے۔ حتیٰ کہ ایسے بھی لوگ ہیں جو کسی ذاتی غرض کے تحت اصل متن میں بالقصد تبدیلی کرتے ہیں اور اپنی طرف سے اس میں ایسی باتیں شامل کر دیتے ہیں جو اصل کتاب میں اس کے مصنف نے شامل نہ کی تھیں۔

پچھلی آسمانی کتابوں میں جو تحریفات ہوئی ہیں ان کی وجہ انسان کی یہی کمزوری ہے۔ قرآن میں ہے کہ خدا نے زمین و آسمان کو سات دنوں (ایّام) میں پیدا کیا۔ یہی بات بائبل میں اس طرح ہے کہ ساتوں دن کی الگ الگ تفصیل ہے۔ ہر دن کی تخلیقات کا ذکر کرنے کے بعد اس میں یہ فقرہ ملتا ہے "اور شام ہوئی اور صبح ہوئی"۔ یہ فقرہ یقینی طور پر مذکورہ بالا ذہن کے تحت انسان کا اضافہ ہے۔ کسی بزرگ نے بطور خود بائبل کے جملہ کو مکمل کرنے کے لیے یہ الفاظ بڑھا دیے۔ قرآن کے الفاظ میں یہ گنجائش ہے کہ دن کو دور

(period)کے معنی میں لے سکیں۔ مگر بائبل میں مذکورہ فقرہ کے اضافہ نے اس کو دور کے معنی میں لینا ناممکن بنادیا۔

بائبل میں اس طرح کی مثالیں بہت ہیں۔ حتیٰ کہ بعض مثالیں نہایت بھونڈی ہیں۔ مثلاً قرآن میں ہے کہ حضرت موسیٰ کو خدا نے یہ معجزہ دیا کہ وہ اپنا ہاتھ نکالیں تو وہ چمکنے لگے۔ مگر بائبل میں اس کا ذکر ہے تو وہاں یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ تو اپنا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھ کر ڈھانک لے۔اس نے اپنا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھ کر اسے ڈھانک لیا۔اور جب اس نے اسے نکال کر دیکھا تو اس کا ہاتھ کوڑھ سے برف کی مانند سفید تھا(خروج،4:7)۔ بائبل کے اس فقرہ میں "کوڑھ سے" یقینی طور پر بعد کے لوگوں کا تشریحی اضافہ ہے۔قرآن کے الفاظ کے مطابق حضرت موسیٰ کے ہاتھ کا چمکنا خدائی سبب سے معلوم ہورہاہے اور بائبل کے الفاظ کے مطابق مرض کے سبب سے۔

قرآن تمام آسمانی کتابوں میں واحد کتاب ہے جس میں کسی قسم کی تحریف نہیں ہو سکی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ پچھلی آسمانی کتابوں کی حفاظت کی ذمہ داری خود ان کتابوں کے حامل انسانوں پر ڈالی گئی تھی۔اس لیے قرآن میں ان کے لیے استحفاظ کا لفظ آیا ہے۔یعنی حفاظت چاہنا: اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللهِ (5:44)۔وہ خدا کی کتاب پر نگہبان ٹھہرائے گئے تھے۔اس کے برعکس، قرآن کے بارے میں حافظ کا لفظ آیا ہے یعنی حفاظت کرنے والا: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (15:9)۔ یہ یاددہانی(قرآن) ہم ہی نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

قرآن میں ایسے بہت سے مواقع تھے جہاں حاملین قرآن کے لیے گنجائش تھی کہ وہ

اس میں مذکورہ بالا قسم کی تبدیلیاں کر ڈالیں۔ کثرت سے اس کی مثالیں موجود ہیں کہ انھوں نے عملاً ایسا کیا بھی مگر انہوں نے جو کچھ کیا وہ "حاشیہ" کی حد تک محدود رہا۔ "متن" میں وہ کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہ کر سکے۔ حاشیہ اور تفسیر میں چونکہ ان کے ہاتھ بندھے ہوئے نہ تھے، اس لیے اس میں انھوں نے طرح طرح کی معصومانہ تبدیلیاں کر دیں۔ مگر جہاں تک متن کا تعلق ہے، اس کو خدا نے براہِ راست اپنی نگرانی میں لے رکھا تھا، اس لیے یہاں وہ کسی قسم کا ردّ و بدل کرنے سے قاصر رہے۔

اس موقع پر وضاحت کے لیے ہم دو مثالیں دیتے ہیں۔ قرآن کی پہلی نزولی آیت ہے: اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِىۡ خَلَقَ (96:1)۔ پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ اسی طرح دوسرے مقام پر ہے: سَنُقۡرِئُكَ فَلَا تَنۡسٰٓى (87:6)۔ ہم تجھ کو پڑھا دیں گے پھر تو نہ بھولے گا۔ ان آیات میں اقرأ اور سنقرء کے الفاظ سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے سامنے کوئی کتاب یا کوئی لکھی ہوئی چیز رکھی گئی اور کہا گیا کہ اس کو پڑھو۔

یہ بات مسلمانوں کے عام عقیدہ کے سراسر خلاف ہے۔ کیونکہ مسلمان ساری دنیا میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ آپ اُمی تھے۔ گویا آیت کے یہ الفاظ اپنے ظاہر کے اعتبار سے مسلمانوں کے عقیدہ میں مانع ہیں اور مخالفین اسلام کو غیر ضروری طور پر یہ کہنے کا موقع دیتے ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اُمی نہیں تھے بلکہ پڑھے لکھے تھے۔ اس کے باوجود ایسا نہیں ہوا کہ دوسری کتابوں کے متن کی طرح مسلمان قرآن کے ان الفاظ کو بدل دیں۔ یہ قرآن کے محفوظ کتاب ہونے کا ایک واضح داخلی ثبوت ہے۔ ورنہ اگر دوسری کتابوں کی طرح کا معاملہ ہوتا تو قرآن میں ہم کو اقرأ (پڑھو) کی جگہ اُتلُ (تلاوت کرو) یا

تَلَفَّظ (بولو) لکھا ہوا ملتا۔ اسی طرح لکھنے والوں نے سَنُقرِئُكَ (ہم تم کو پڑھائیں گے) کے بجائے سنحفظک (ہم تمھارے لیے محفوظ کر دیں گے) لکھ دیا ہوتا۔

اسی طرح ایک مثال سورہ القیامۃ کی آیت ہے: وَقِيلَ مَنْ راقٍ (75:27)۔ اور کہا جائے گا کہ کوئی جھاڑ پھونک والا۔ تمام دنیا کے مسلمان جب اس آیت کو پڑھتے ہیں تو وہ مَنْ پر وقفہ (pause) کرتے ہیں۔ یعنی مَنْ کے بعد کسی قدر رک کر راقٍ کہتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سننے والے اصحاب نے بیان کیا کہ آپ نے جب یہ آیت پڑھی تو آپ نے حرف مَنْ پر وقفہ (pause) کیا۔ ورنہ نحو وصرف کے فن (عربی گریمر) کے اعتبار سے اس کی کوئی بھی وجہ نہیں ہے کہ یہاں یہ وقفہ کیوں کیا جائے۔ اگر قرآن کے ساتھ اس کے حاملین وہ معاملہ کر سکتے جو دوسری کتابوں کے ساتھ اس کے حاملین نے کیا تو لازماً ایسا ہوتا کہ یہ وقفہ باقی نہ رہتا۔ ایسی حالت میں مسلمان اس کو وَقِيلَ مَنْ راقٍ پڑھتے، نہ کہ وَقِيلَ مَنْ (سکتہ) راقٍ۔

اسی طرح قرآن میں ہے:

يا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذا طَلَّقْتُمُ النِّساءَ (65:1)۔ اے نبی، جب تم لوگ عورتوں کو طلاق دو۔

یہ جملہ نحو وصرف کے عام قاعدہ کے خلاف ہے۔ اس میں واحد سے خطاب کر کے جمع کی ضمیر لائی گئی ہے۔ عام لکھنے اور بولنے والے کبھی ایسا نہیں کرتے۔ اگر قرآن کا وہ معاملہ ہوتا جو دوسری آسمانی کتابوں کا ہے تو یقینی طور پر ایسا ہوتا کہ کچھ مسلمان اس آیت کے الفاظ کو بدل کر اس طرح لکھ چکے ہوتے:

یا ایّھا النبی اذا طلقت النساء (اے نبی، جب تو عورتوں کو طلاق دے)، یا ایھا الرسل اذا طلقتم النساء(اے رسولو، جب تم سب لوگ عورتوں کو طلاق دو)۔

یہی معاملہ طرز تحریر کا ہے۔ عربی فن خطاطی نے بعد کے زمانے میں بہت زیادہ ترقی کی۔ جب کہ قرآن اس وقت لکھا گیا جب کہ فنِّ خطاطی نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ چنانچہ قرآن کے طرز کتابت میں اور عام خطوں کے طرز کتابت میں بہت سے مقامات پر فرق ہے۔ مثلاً قرآن میں مَالِک کو مٰلِک لکھا ہوا ہے۔ حتیٰ کہ اس طرز کتابت کی وجہ سے آیت کے دو تلفظ بن گئے ہیں۔ کوئی اس کو مَا لِک یَوْم الدین پڑھ رہا ہے اور کوئی اس کو مَلِک یوم الدین (1:4) پڑھتا ہے۔ اس کے باوجود کسی کے لیے یہ ممکن نہ ہوا کہ آیت کا املاء بدل کر اس کو مالک یوم الدین بنا دے۔

قرآن کے حاشیہ میں بعد کے لوگوں نے جو معنوی تبدیلیاں کی ہیں۔ ان میں سے ایک مثال قرآن کی یہ آیت ہے: إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (2:30)۔ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ بعد کے متعدد مفسرین نے اس آیت میں خلیفہ کے لفظ کو خلیفۃ اللہ کے ہم معنی بنا دیا اور اس کی تشریح ان الفاظ میں کی کہ — خدا نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں **اپنا** ایک خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں۔

حالانکہ "اپنا" کا لفظ یہاں سراسر اضافہ ہے۔ ان حضرات نے حاشیہ میں تو اس قسم کے اضافے خوب کیے، مگر متن میں اضافہ کرنا ان کے لیے ممکن نہ ہو سکا۔ اگر قرآن کے متن پر خدا کا پہرہ نہ ہوتا تو غالباً وہ آیت کے الفاظ کو ناکافی سمجھ کر اس کو اس طرح لکھ دیتے:

انی جاعل فی الارض خلیفتی (میں زمین میں اپنا خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں) یا انی جاعل فی الارض خلیفة منی (میں زمین میں اپنی جانب سے ایک خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں)

دوسری آسمانی کتابوں میں سے ہر کتاب میں یہ ہوا ہے کہ ان کتابوں کے ماننے والے اپنے طور پر جو کچھ چاہتے تھے وہ سب انھوں نے خدا کی کتاب میں کہیں نہ کہیں داخل کر دیا۔ مثال کے طور پر یوحنا کی موجودہ انجیل میں ہم کو یہ فقرہ ملتا ہے:

" دوسرے دن اس نے یسوع کو اپنی طرف آتے دیکھ کر کہا، دیکھو یہ خدا کا برّہ ہے جو دنیا کا گناہ اٹھا لے جاتا ہے۔ یہ وہی ہے جس کی بابت میں نے یہ کہا تھا کہ ایک شخص میرے بعد آتا ہے جو مجھ سے مقدم ٹھہرا ہے کیونکہ وہ مجھ سے پہلے تھا" (یوحنا،30-1:29)۔

انجیل یوحنا کا یہ فقرہ حضرت یحیٰ کی زبان سے حضرت مسیح کے بارے میں ہے۔ حضرت یحیٰ کی یہ تقریر بقیہ تینوں انجیلوں میں بھی ہے مگر ان میں "جو دنیا کا گناہ اٹھا لے جاتا ہے" موجود نہیں۔ یہ الفاظ یقینی طور پر بعد کو اصل تقریر میں اس لیے بڑھائے گئے تا کہ ان سے کفارہ کا عقیدہ نکالا جا سکے۔ بعد کے مسیحیوں کا پسندیدہ عقیدہ (کفارہ) کو انجیل سے ثابت کرنے کے لیے حضرت یحیٰ کی مذکورہ تقریر میں یہ جملہ بڑھا دیا گیا۔ حالانکہ وہ اگر حضرت یحیٰ کا جملہ ہوتا تو چاروں انجیلوں میں موجود ہوتا۔

یہی بات قرآن میں بھی ہو سکتی تھی۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے بہت سے انتہائی محبوب عقیدے بھی قرآن کے متن کے اندر موجود نہیں۔ مثال کے طور پر رسول

صلی اللہ علیہ وسلم کا افضل الانبیاء ہونا اور خدا کے یہاں آپ کا شفیع المذنبین ہونا مسلمانوں کے محبوب ترین عقائد ہیں۔ مگر قرآن میں کسی مقام پر وہ واضح طور پر موجود نہیں ہیں۔ مسلمان یہ تو کر سکے کہ اپنے ان عقائد کو بعض آیات سے بطریق استنباط نکالیں۔ مگر وہ ان کو متن قرآن میں داخل نہ کر سکے۔ اگر مسلمانوں کو متن میں تصرف کی قدرت حاصل ہوتی تو یقیناً آج ہم قرآن میں کوئی ایسی آیت پڑھتے جس کے یہ الفاظ ہوتے:

یامحمد انت افضل الانبیاء وانت شفیع المذنبین یوم القیامۃ

(اے محمد، تم افضل الانبیاء ہو، تم قیامت کے دن گناہ گاروں کی سفارش کرنے والے ہو)

یہ چند سادہ قسم کی داخلی مثالیں ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن آج بھی اسی ابتدائی حالت میں موجود ہے جس حالت میں اس کے پیغمبر حضرت محمد نے اسے اپنے زمانے میں لکھوایا تھا۔ اس میں کسی قسم کا معمولی تغیر بھی نہ ہو سکا۔

اب ظاہر ہے کہ قرآن جب واحد آسمانی کتاب ہے جس کا متن پوری طرح محفوظ ہے تو اسی کا حق ہے کہ وہ ان تمام لوگوں کے لیے واحد رہنما کتاب بنے جو وحی الٰہی کو مانتے ہیں اور خدا کی ہدایت کے مطابق زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ محفوظ اور غیر محفوظ دونوں قسم کی کتابوں کی موجودگی میں یقینی طور پر محفوظ کتاب کی پیروی کی جائے گی، نہ کہ غیر محفوظ اور تبدیل شدہ کتاب کی۔

خدائی اہتمام

یہود کو خدا کی طرف سے یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ تورات کی حفاظت کریں : بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ (5:44)۔اس کے برعکس، قرآن کے بارے میں ارشاد ہوا ہے :اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ(15:9)۔ ہم نے قرآن اتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ پچھلی آسمانی کتابوں کو محفوظ رکھنے کی ذمہ داری ان کی قوموں پر ڈالی گئی تھی، جب کہ قرآن کو محفوظ رکھنے کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لی ہے۔ پچھلی آسمانی کتابیں بھی اسی طرح خدا کی کتاب تھیں جس طرح قرآن خدا کی کتاب ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ پچھلی آسمانی کتابوں کے حامل ان کتابوں کی حفاظت کے بارے میں اپنی ذمہ داری کو پورا نہ کرسکے۔ یہ کتابیں اپنی اصلی صورت میں باقی نہ رہیں۔ مگر قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ نے لی تھی اس لیے قرآن خدا کی خصوصی مدد سے مکمل طور پر محفوظ رہا۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آسمان سے خدا کے فرشتے اتریں گے اور وہ قرآن کو اپنے سایہ میں لیے رہیں گے۔ موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں اخروی حقیقتوں کو غیب میں رکھا گیا ہے۔اس لیے یہاں کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ فرشتے سامنے آکر قرآن کی حفاظت کرنے لگیں۔ موجودہ دنیا میں اس قسم کا کام ہمیشہ معمول کے حالات میں کیا جاتا ہے، نہ کہ غیر معمولی حالات میں۔ یہاں قرآن کی حفاظت کا کام تاریخی اسباب اور چلتے پھرتے انسانوں کے ذریعہ لیا جائے گا تاکہ غیب کا پردہ باقی رہے۔ واقعات بتاتے ہیں کہ خدا نے اپنے وعدہ کو پوری تاریخ میں نہایت اعلیٰ پیمانے پر انجام دیا ہے۔اس مقصد کے لیے اس

نے مختلف قوموں سے مدد لی ہے۔ نیز اس کام میں مسلمانوں کو بھی استعمال کیا گیا ہے اور غیر مسلموں کو بھی۔

پچھلے انبیاء کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ ان کو بہت کم ایسے ساتھی ملے جو ان کے بعد ان کی کتاب کی حفاظت کی مضبوط ضمانت بن سکتے۔ مگر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ نمایاں طور پر دوسرے انبیاء سے مختلف ہے۔ وفات سے تقریباً ڈھائی ماہ پہلے آپ نے حج کیا جس کو حجۃ الوداع کہا جاتا ہے۔ اس موقع پر عرفات کے میدان میں ایک لاکھ چالیس ہزار مسلمان موجود تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر وقت تک آپ کے اوپر ایمان لانے والے مردوں اور عورتوں کی کل تعداد کم از کم پانچ لاکھ ہو چکی ہو گی۔ یہ تعداد قدیم انسانی آبادی کے لحاظ سے بہت غیر معمولی ہے۔ آپ کے بعد یہ تعداد بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ ملک کے ملک مسلمان ہوتے چلے گئے۔ اس طرح قرآن کی حفاظت کی پشت پر اتنا بڑا انسانی گروہ اکٹھا کر دیا گیا جو اس سے پہلے کسی آسمانی کتاب کی حفاظت کے لیے اکٹھا نہیں ہوا تھا۔

اس کے بعد دوسرا مددگار واقعہ یہ ظہور میں آیا کہ عرب اور عرب کے باہر مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ سلسلہ یہاں تک پھیلا کہ قدیم آباد دنیا کے بیشتر حصہ پر مسلمان قابض ہو گئے اور انہوں نے دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے مضبوط سلطنت قائم کی۔ یہ سلطنت کسی طاقت سے مغلوب ہوئے بغیر مسلسل قائم رہی اور قرآن کی حفاظت کرتی رہی۔ یہ سلسلہ ایک ہزار سال تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ زمانہ پریس کے دور میں پہنچ گیا اور قرآن کے ضائع ہونے کا امکان سرے سے ختم ہو گیا۔

پریس کے دور میں یہ ممکن ہو گیا کہ کسی کتاب کا ایک نسخہ لکھا جائے اور اس کو چھاپ کر ایک ہی قسم کے کروڑوں نسخے تیار کر لیے جائیں۔ مگر پہلے ایسا ممکن نہ تھا۔ قدیم زمانے میں کتاب کا ہر نسخہ الگ الگ ہاتھ سے لکھا جاتا تھا۔ اس کی وجہ سے اکثر ایک نسخہ اور دوسرے نسخے میں کچھ نہ کچھ فرق ہو جاتا تھا۔ چنانچہ قدیم کتابوں میں سے جو کتاب بھی آج دنیا میں پائی جاتی ہے اس کے مختلف قلمی نسخوں میں سے کوئی بھی دو نسخہ ایسا نہیں جو فرق سے خالی ہو۔ یہ صرف قرآن ہے جس کے لاکھوں نسخے قدیم زمانے میں ہاتھ سے لکھ کر تیار کیے گئے۔ ان کی ایک بڑی تعداد آج بھی میوزیم اور کتب خانوں میں موجود ہے۔ مگر ایک قلمی نسخے اور دوسرے قلمی نسخے میں کوئی ادنٰی فرق نہیں پایا جاتا۔ یہ خدا کی خصوصی مدد تھی جس نے قرآن کے بارے میں مسلمانوں کو اتنا زیادہ مستعد اور حساس بنا دیا۔

اسی کے ساتھ خدا نے یہ انتظام کیا کہ قرآن کے حفظ (رٹ کر اس کے متن کو یاد کرنے) کا نادر طریقہ شروع ہوا جو اس سے پہلے معلوم تاریخ میں کبھی کسی کتاب کے لیے نہیں کیا گیا تھا۔ ہزاروں لاکھوں لوگوں کے دل میں یہ جذبہ ابھر آیا کہ وہ قرآن کے متن کو شروع سے آخر تک یاد کریں اور یاد رکھیں۔ اس طرح کے افراد تاریخ کے ہر دور میں ہزاروں کی تعداد میں پیدا ہوتے رہے۔ یہ سلسلہ قرآن کے زمانے سے شروع ہو کر آج تک جاری ہے۔ معلوم تاریخ کے مطابق دنیا میں کوئی بھی دوسری کتاب نہیں ہے جس کے ماننے والوں نے اس طرح اس کو یاد کرنے کا اہتمام کیا ہو جس طرح قرآن کے ماننے والے ہر دور میں کرتے رہے ہیں۔ قرآن کو یاد کرنے کے رواج نے اس کی حفاظت کے اس انوکھے انتظام کو ممکن بنا دیا، جس کو ایک فرانسیسی مستشرق نے دہرا جانچ (double

checking) کا طریقہ کہا ہے۔ یعنی ایک لکھے ہوئے نسخے سے ملانا اور اسی کے ساتھ حافظہ کی مدد سے اس کی صحت کو جانچتے رہنا۔

ڈیڑھ ہزار برس کی اسلامی تاریخ میں یہ جو کچھ ہوا خدا کی طرف سے ہوا۔ امتحانی حالات کو باقی رکھنے کے لیے اگرچہ اس کو اسباب کے پردہ میں انجام دیا گیا ہے۔ تاہم جب قیامت آئے گی اور تمام حقیقتیں برہنہ کر دی جائیں گی، اس وقت لوگ دیکھیں گے کہ عرب کے اسلامی انقلاب سے لے کر دور پریس کے نئے حفاظتی طریقوں تک سارے کام خدا خود براہِ راست انجام دیتا تھا۔ اگرچہ ظاہری طور پر وہ کچھ ہاتھوں کو اس کا ذریعہ بناتا رہا۔

قرآن کے بارے میں خدا کے اس خصوصی انتظام کا ایک اور اہم پہلو ہے جس کا تعلق مخصوص طور پر مسلمانوں سے ہے۔ قرآن کے الفاظ کی حفاظت جو مسلمانوں کے ہاتھوں ہو رہی ہے یہی دراصل وہ چیز نہیں ہے جو قرآن کے سلسلے میں اللہ کو ہم سے مطلوب ہو۔ یہ کام تو خدا کے براہِ راست اہتمام میں ہو رہا ہے، پھر ہمارا اس میں کیا کمال۔ جو لوگ اس حفاظتی کام میں مشغول ہیں وہ اپنے اخلاص کے بقدر اپنا معاوضہ پائیں گے۔ مگر یہی امت مسلمہ کی اصل ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ کام خواہ کتنے ہی اخلاص کے ساتھ اور کتنے ہی بڑے پیمانے پر کیا جائے، اس سے ہماری اصل ذمہ داری ساقط نہیں ہو سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ پچھلی قوموں کا امتحان حفاظت متن میں تھا، امت مسلمہ کا امتحان حفاظتِ معانی میں ہے۔ پچھلے زمانوں میں جو لوگ کتاب خداوندی کے حامل بنائے گئے ان کی آزمائش معانی کی حفاظت کے ساتھ یکساں طور پر متن کی حفاظت میں بھی تھی۔ مگر مسلمانوں کی آزمائش سب سے بڑھ کر معانی کی حفاظت میں ہے۔ مسلمانوں کو قرآن کے

سلسلے میں جس چیز کا ثبوت دینا ہے وہ یہ کہ وہ قرآن کی تشریح و تعبیر میں فرق نہ کریں۔ قرآن میں جس چیز کو جس درجہ میں رکھا گیا ہے اس کو اسی درجہ میں رکھیں۔ وہ قرآن کے نشانے میں کوئی تفسیری تبدیلی نہ کریں۔ قرآن کو دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہوئے وہ اسی اصل بات کو پیش کریں جو خود قرآن میں عربی زبان میں اتاری گئی ہے، نہ کہ اپنی خود ساختہ تشریحات کے ذریعہ ایک نیا دین بنائیں اور اس کو قرآن کے نام پر لوگوں کے سامنے پیش کرنے لگیں۔

مسلمانوں کا قرآن کا حامل بننے میں ناکام ہونا یہ ہے کہ وہ قرآن کو برکت اور ثواب کی کتاب بنادیں اور اپنے دین کی گاڑی عملاً دوسری بنیادوں پر چلنے لگیں۔ کوئی مسائل کے نام پر سرگرمی دکھانے لگے اور کوئی فضائل کے نام پر۔ کوئی بزرگوں کے ملفوظات اور کہانیوں کو دین کی بنیاد بنالے اور کوئی جلسوں اور تقریروں کی دھوم مچانے کو۔ کوئی قرآن کو اپنی سیاسی تحریک کا ضمیمہ بنالے اور کوئی اپنے قومی ہنگاموں کا۔ قرآن کے نام پر یہ تمام سرگرمیاں قرآن کے معانی میں تحریف کا درجہ رکھتی ہیں۔ مسلمان اگر قرآن کے معانی کے ساتھ اس قسم کا معاملہ کر رہے ہوں تو وہ صرف اس بنا پر خدا کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے کہ قرآن کے الفاظ کی حفاظت اور تکرار میں انھوں نے کمی نہیں کی تھی۔

اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ کتاب الٰہی کی حامل دوسری قوموں کو جو سزا متن کتاب کی تبدیلی پر دی گئی، وہ سزا مسلمانوں کو معانی کتاب کی تبدیلی پر ملے گی۔ مسلمانوں کا اصل امتحان جہاں ہو رہا ہے وہ یہی ہے۔ اگر وہ کتاب اللہ کے معانی کو اپنی خود ساختہ تعبیرات سے بدل ڈالیں تو وہ صرف اس لیے خدا کی پکڑ سے نہیں بچ سکتے کہ انھوں

نے کتاب کے متن میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ کیونکہ امتحان آدمی کے اپنے دائرہ اختیار میں ہوتا ہے۔ اور مسلمانوں کو جہاں اختیار حاصل ہے وہ قرآن کے معانی میں تبدیلی ہے، نہ کہ قرآن کے متن میں تبدیلی۔ متن قرآن میں تبدیلی سے تو خدا نے تمام قوموں کو عاجز کر رکھا ہے، پھر وہاں کسی کا امتحان کس طرح ہوگا۔

تیسرا حصّہ

دعوتِ قرآن

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً (16:89)۔

اور ہم نے تمھارے اوپر قرآن اتارا بیان کرنے والا ہر چیز کا

اور ہدایت اور رحمت۔"

منصوبۂ خداوندی

حضرت آدم پہلے انسان تھے اور اسی کے ساتھ پہلے پیغمبر بھی۔ بعض روایات کے مطابق حضرت آدم کے بعد تقریباً ایک ہزار سال تک آپ کی نسل توحید اور دین حق پر قائم رہی۔ اس کے بعد ملت آدم میں شرک کا غلبہ ہو گیا (البقرہ، 2:213)۔ حضرت نوح اسی ملت آدم کی اصلاح کے لیے آئے جو اس وقت دجلہ اور فرات کے سرسبز علاقے میں آباد تھی۔

تاہم حضرت نوح کی طویل کوششوں کے باوجود ملت آدم دوبارہ مشرکانہ دین کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوئی۔ ان میں سے صرف چند آدمی تھے جو حضرت نوح پر ایمان لائے۔ چنانچہ عظیم طوفان آیا اور چند مومنین کو چھوڑ کر باقی تمام لوگ غرق کر دیے گئے۔ اس کے بعد ملت نوح کے ذریعہ دوبارہ انسانی نسل چلی۔ لیکن دوبارہ وہی قصہ پیش آیا جو اس سے پہلے پیش آچکا تھا۔ کچھ عرصہ بعد بیشتر لوگ دین توحید کو چھوڑ کر دین شرک پر چل پڑے۔ یہی قصہ ہزاروں سال تک بار بار پیش آتا رہا۔ خدا نے لگاتار پیغمبر بھیجے (المومنون، 23:44)۔ مگر انسان ان سے نصیحت قبول کرنے پر تیار نہ ہوا۔ حتیٰ کہ تمام پیغمبروں کو استہزاء کا موضوع بنا لیا گیا (یٰس، 36:30)۔

یہ سلسلہ ہزاروں برس تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ تاریخ میں شرک کا تسلسل قائم ہو گیا۔ اس زمانے کے انسانی معاشروں میں جو شخص بھی پیدا ہوتا وہ اپنے ماحول کی ہر چیز سے شرک کا سبق لیتا۔ مذہبی رسموں، سماجی تقریبات، قومی میلے اور حکومتی نظام تک ہر چیز مشرکانہ عقائد پر قائم ہو گئی۔ نوبت یہاں تک آپہنچی کہ جو انسان بھی پیدا ہو وہ شرک کی فضا

میں آنکھ کھولے اور شرک ہی کے ماحول میں اس کا خاتمہ ہو جائے۔اسی چیز کو میں نے تاریخ میں شرک کا تسلسل قائم ہو جانے سے تعبیر کیا ہے،اور یہی وہ حقیقت ہے جو حضرت نوح کی دعامیں ان الفاظ میں ملتی ہے:

وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا (71:27)۔اور ان کی نسل سے جو بھی پیدا ہو گا، وہ بدکار اور سخت منکر ہی ہو گا۔

اب تاریخ حضرت ابراہیم تک پہنچ چکی تھی جن کا زمانہ 2100 قبل مسیح ہے۔خود حضرت ابراہیم نے قدیم عراق میں جو اصلاحی کوششیں کیں ان کا بھی وہی انجام ہوا جو آپ سے پہلے دوسرے نبیوں کا ہوا تھا۔اس وقت اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لیے منصوبہ بنایا۔وہ منصوبہ یہ تھا کہ خصوصی اہتمام کے ذریعے ایک ایسی نسل تیار کی جائے جو شرک کے تسلسل سے منقطع ہو کر پرورش پائے۔اپنی فطری حالت پر قائم رہنے کی وجہ سے اس کے لیے توحید کو قبول کرنا آسان ہو جائے۔پھر اسی گروہ کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا جائے کہ وہ تاریخ میں جاری ہونے والے شرک کے تسلسل کو توڑے۔

اس وقت حضرت ابراہیم کو حکم ہوا کہ وہ عراق اور شام اور مصر اور فلسطین جیسے آباد علاقوں کو چھوڑ کر قدیم مکہ کے غیر آباد علاقے میں جائیں۔اور وہاں اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے شیر خوار بچے اسماعیل کو بسا دیں۔یہ علاقہ وادی غیر ذی زرع ہونے کی وجہ سے اس زمانے میں بالکل غیر آباد تھا۔اس بنا پر وہ قدیم مشرکانہ تہذیب سے پوری طرح پاک تھا۔حضرت ابراہیم کی دعامیں عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ (14:37) سے یہی چیز مراد ہے۔یعنی ایک ایسا مقام جو شرک کی پہنچ سے دور ہو۔حضرت ابراہیم کی اس دعا کا مطلب یہ تھا کہ خدایا، میں نے اپنی اولاد کو ایک

بالکل غیر آباد علاقہ میں بسا دیا ہے۔ جہاں مشرکانہ تہذیبوں کے اثرات ابھی تک نہیں پہنچے ہیں۔ ایسا میں نے اس لیے کیا ہے تاکہ وہاں ایک ایسی نسل پیدا ہو جو شرک کے تسلسل سے منقطع ہو کر پرورش پائے اور حقیقی معنوں میں توحید کی پرستار بن سکے۔

کسی تہذیبی تسلسل سے منقطع ہو کر پرورش پانا کیا معنی رکھتا ہے۔ اس کی وضاحت ایک جزئی مثال سے ہوتی ہے، راقم الحروف ایک ایسے علاقے میں رہنے والا ہے جس کی زبان اردو ہے۔ میرے باپ اردو بولتے تھے۔ میں بھی اردو بولتا ہوں اور میرے بچوں کی زبان بھی اردو ہے۔ اب یہ ہوا کہ میرے ایک لڑکے نے لندن میں ایک ایسے علاقے میں رہائش اختیار کر لی جہاں صرف انگریزی بولنے والے لوگ رہتے ہیں اور ہر طرف انگریزی زبان کا ماحول ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے اس لڑکے کے بچے اب صرف انگریزی زبان جانتے ہیں۔ وہ اردو میں اظہار خیال کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ میں لندن گیا تو اپنے ان پوتوں سے مجھے انگریزی زبان میں بات کرنی پڑی۔

میرے ان پوتوں کا یہ حال اس لیے ہوا کہ اردو کے تسلسل سے منقطع ہو کر ان کی پرورش ہوئی۔ اگر وہ میرے ساتھ دہلی میں ہوتے تو ان بچوں کا یہ معاملہ کبھی نہ ہوتا۔

ذبح اسماعیل کے واقعے کی حقیقت بھی یہی ہے۔ حضرت ابراہیم کو جو خواب (الصافات، 37:102) دکھایا گیا، وہ ایک تمثیلی خواب تھا۔ اگرچہ حضرت ابراہیم اپنی انتہائی وفاداری کی بنا پر اس کی حقیقی تعمیل کے لیے آمادہ ہو گئے۔ قدیم مکہ میں نہ پانی تھا، نہ سبزہ اور نہ زندگی کا کوئی سامان۔ ایسی حالت میں اپنی اولاد کو وہاں بسانا یقیناً ان کو ذبح کرنے کے ہم معنی تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان کو جیتے جی موت کے حوالے کر دیا جائے۔ شرک کے تسلسل

سے منقطع کر کے نئی نسل پیدا کرنے کا منصوبہ کسی ایسے مقام پر ہی زیرِ عمل لایا جا سکتا تھا۔ جہاں اسبابِ حیات نہ ہوں اور اس بنا پر وہ انسانی آبادی سے خالی ہو۔ حضرت ابراہیم کے خواب کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی اولاد کو معاشی اور سماجی حیثیت سے ذبح کر کے مذکورہ نسل تیار کرنے میں خدائی منصوبے کا ساتھ دیں۔

یہ منصوبہ چونکہ اسباب کے دائرہ میں زیرِ عمل لانا تھا اس لیے اس کی باقاعدہ نگرانی بھی ہوتی رہی۔ حضرت ابراہیم خود فلسطین میں مقیم تھے۔ مگر وہ کبھی کبھی اس کی جانچ کے لیے مکہ جاتے رہتے تھے۔

ابتداءً اس مقام پر صرف ہاجرہ اور اسماعیل تھے۔ بعد کو جب وہاں زمزم کا پانی نکل آیا تو قبیلہ جرہم کے کچھ خانہ بدوش افراد یہاں آکر آباد ہو گئے۔ حضرت اسماعیل بڑے ہوئے تو انھوں نے قبیلہ جرہم کی ایک لڑکی سے نکاح کر لیا۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت ابراہیم ایک بار فلسطین سے چل کر مکہ پہنچے تو اس وقت حضرت اسماعیل گھر پر موجود نہ تھے۔ حضرت ابراہیم نے ان کی بیوی سے حال دریافت کیا۔ بیوی نے کہا کہ ہم بہت برے حال میں ہیں، اور زندگی مصیبتوں میں گزر رہی ہے۔ حضرت ابراہیم یہ کہہ کر واپس ہو گئے کہ جب اسماعیل آئیں تو ان کو میرا سلام کہنا اور یہ کہنا کہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ بدل دو (غَيِّرْ عَتَبَةَ بَابِكَ)۔ حضرت اسماعیل جب لوٹے اور بیوی سے یہ روداد سنی تو وہ سمجھ گئے کہ یہ میرے والد تھے اور ان کا پیغام تمثیل کی زبان میں یہ ہے کہ میں موجودہ عورت کو چھوڑ کر دوسری عورت سے رشتہ کر لوں۔ چنانچہ انھوں نے اس کو طلاق دے دی اور قبیلہ کی دوسری عورت سے شادی کر لی۔ حضرت ابراہیم کی نظر میں وہ عورت اس قابل نہ تھی کہ وہ زیر تیاری نسل کی

ماں بن سکے (صحيح البخاري، حديث نمبر 3185)۔

کچھ عرصہ بعد حضرت ابراہیم دوبارہ مکہ آئے۔اب بھی حضرت اسماعیل گھر پر نہ تھے۔البتہ ان کی دوسری بیوی وہاں موجود تھیں۔اس سے حال پوچھاتواس نے قناعت اور شکر کی باتیں کیں اور کہا کہ ہم بہت اچھے حال میں ہیں۔حضرت ابراہیم یہ کہہ کر واپس ہو گئے کہ جب اسماعیل آئیں توان سے میرا سلام کہنااور یہ پیغام دے دینا کہ اپنے گھر کی چوکھٹ باقی رکھو (ثَبِّت عَتَبَةَ بَابِكَ)۔حضرت اسماعیل جب واپس آئے اور روداد سنی تو سمجھ گئے کہ یہ میرے والد تھے،اوران کے پیغام کا مطلب یہ ہے کہ اس عورت کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ وہ پیش نظر منصوبے سے مطابقت کر کے رہ سکے،اور پھر اس سے وہ نسل تیار ہو جس کا یہاں تیار کرنااللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے (صحيح البخاري، حديث نمبر 3185)۔

اس طرح صحرائے عرب کے الگ تھلگ ماحول میں ایک نسل بننا شروع ہوئی۔اس نسل کی خصوصیات کیا تھیں،اس کے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ نسل بیک وقت دو خصوصیات کی حامل تھی،ایک الفطرۃ اور دوسرے المروۃ۔

صحرائے عرب کے ماحول میں فطرت کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی جو انسان کو متاثر کرے۔کھلے بیابان،اونچے پہاڑ،رات کے وقت وسیع آسمان میں جگمگاتے ہوئے تارے، وغیرہ۔اس قسم کے قدرتی مناظر چاروں طرف سے انسان کو توحید کا سبق دے رہے تھے۔وہ ہر وقت اس کو خدا کی عظمت اور کاریگری کی یاد دلاتے تھے۔اسی خالص ربانی ماحول میں پرورش پا کر وہ قوم تیار ہوئی جو حضرت ابراہیم کے الفاظ میں اس بات کی صلاحیت رکھتی تھی کہ وہ حقیقی معنوں میں امت مسلمہ (البقرہ،2:128)بن سکے۔یعنی

اپنے آپ کو پوری طرح خدا کے سپرد کر دینے والی قوم۔ یہ ایک ایسی قوم تھی جس کی فطرت اپنی ابتدائی حالت میں محفوظ تھی، اسی لیے وہ دین فطرت کو قبول کرنے کی پوری استعداد رکھتی تھی۔

اسی کے ساتھ دوسری چیز جس کو پیدا کرنے کے لیے یہ ماحول خصوصی طور پر موزوں تھا وہ وہی ہے جس کو عربی زبان میں الْمُرُوءَة (مردانگی) کہتے ہیں۔ قدیم حجاز کے سنگلاخ ماحول میں زندگی نہایت مشکل تھی۔ وہاں خارجی اسباب سے زیادہ انسانی اوصاف کارآمد ہو سکتے تھے۔ وہاں بیرونی ماحول میں وہ چیزیں موجود نہ تھیں جن پر انسان بھروسہ کرتا ہے۔ وہاں انسان کے پاس ایک ہی چیز تھی، اور وہ اس کا اپنا وجود تھا۔ ایسے ماحول میں قدرتی طور پر ایسا ہونا تھا کہ انسان کے اندرونی اوصاف زیادہ سے زیادہ اجاگر ہوں۔ اس طرح دو ہزار سالہ عمل کے نتیجے میں وہ قوم بن کر تیار ہوئی جس کے اندر حیرت انگیز طور پر اعلیٰ مردانہ اوصاف تھے۔ پروفیسر فلپ ہٹی کے الفاظ میں پورا عرب ہیروؤں کی ایک ایسی نرسری (nursery of heroes) میں تبدیل ہو گیا جس کی مثال نہ اس سے پہلے تاریخ میں کبھی پائی گئی اور نہ اس کے بعد۔

History of the Arabs by Philip K. Hitti, Macmillan, 1989 p. 142

چھٹی صدی عیسوی میں وہ وقت آ گیا تھا کہ تاریخ میں شرک کے تسلسل کو توڑنے کا منصوبہ تکمیل تک پہنچایا جائے۔ چنانچہ بنو اسماعیل کے اندر پیغمبر آخر الزماں (حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلم) پیدا کر دیے گئے، جن کے بارے میں قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ، وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (61:9)۔ وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ، تاکہ وہ اس کو سب دینوں پر غالب کردے خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ پیغمبر آخر الزماں کا خاص مشن یہ تھا کہ دین شرک کو غلبہ کے مقام سے ہٹا دیں اور دین توحید کو غالب دین کی حیثیت سے دنیا میں قائم کردیں۔ اس غلبے سے مراد اصلاً فکری اور نظریاتی غلبہ ہے۔ یعنی تقریباً اسی قسم کا غلبہ جیسا کہ موجودہ زمانے میں سائنسی علوم کو روایتی علوم کے اوپر حاصل ہوا ہے۔

یہ غلبہ تاریخ کا مشکل ترین منصوبہ تھا۔ اس کا کچھ اندازہ اس مثال سے ہو سکتا ہے کہ قدیم روایتی علوم کو اگر جدید سائنسی علوم پر غالب کرنے کی مہم چلائی جائے تو وہ کس قدر دشوار ہو گی۔ اسی طرح ساتویں صدی عیسوی میں یہ بے حد مشکل کام تھا کہ مشرکانہ تہذیب کو مغلوب کیا جائے اور اس کی جگہ توحید کو غالب فکر کا مقام عطا کیا جائے۔ کسی نظام کے فکری غلبے کو ختم کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی درخت کو اس کی تمام جڑوں سمیت اکھاڑ پھینکنا۔ اس قسم کا کام ہمیشہ بے حد مشکل کام ہوتا ہے جو نہایت گہری منصوبہ بندی اور زبردست جدوجہد کے بعد ہی انجام دیا جا سکتا ہے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو دو خاص امدادی چیزیں فراہم کی گئیں۔ ایک وہ جس کا ذکر کُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (3:110) میں ہے۔ یعنی تم بہترین گروہ ہو جس کو لوگوں کے واسطے نکالا گیا ہے۔ دو ہزار سال کے عمل کے نتیجہ میں ایک ایسا گروہ تیار کیا گیا جو وقت کا بہترین گروہ تھا۔ جیسا کہ عرض کیا گیا،

ایک طرف وہ اپنی تخلیقی فطرت پر قائم تھا۔دوسری طرف وہ چیز اس کے اندر کمال درجہ میں موجود تھی جس کو اخلاقی کردار یا مردانہ اوصاف کہا جاتا ہے۔اسی گروہ کے بہترین منتخب افراد، قبول اسلام کے بعد وہ لوگ بنے جن کو اصحاب رسول کہا جاتا ہے۔

دوسری خصوصی مدد وہ تھی جس کی طرف سورہ الروم کی ابتدائی آیات میں اشارہ ملتا ہے۔رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دنیا میں دو بڑی مشرکانہ سلطنتیں تھیں۔ایک رومی (بازنطینی) سلطنت،دوسرے ایرانی (ساسانی) سلطنت۔اس وقت کی آباد دنیا کا اکثر حصہ، براہِ راست یا بالواسطہ طور پر،انھیں دونوں سلطنتوں کے زیر قبضہ تھا۔توحید کو وسیع تر دنیا میں غالب کرنے کے لیے ان دونوں مشرک سلطنتوں سے سابقہ پیش آنا لازمی تھا۔خدا نے یہ کیا کہ عین اسی زمانے میں دونوں سلطنتوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا دیا۔ان کی یہ لڑائی نسلوں تک جاری رہی۔ایک بار ایرانی اٹھے اور رومیوں کی طاقت کو تہس نہس کر کے ان کی مملکت کے بڑے حصے پر قابض ہو گئے۔دوسری بار رومی اٹھے اور انھوں نے ایرانیوں کی طاقت کو بالکل توڑ ڈالا۔یہی وجہ ہے کہ بنو اسماعیل (اصحاب رسول) جب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تحت منظم ہو کر اٹھے تو انھوں نے بے حد کم عرصے میں ایشیا اور افریقہ کے بڑے حصے کو فتح کر ڈالا اور ہر طرف شرک کو مغلوب اور توحید کو غالب کر دیا۔

اس سلسلے میں یہاں پروفیسر ہٹی کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے:

The enfeebled condition of the rival Byzantines and Sasanids who had conducted internecine against each other for many generations the heavy taxes, consequent upon these wars, imposed on the citizens of both empires and

undermining their sense of loyalty, ...all these paved the way for the surprisingly rapid progress of Arabian arms. (Philip K. Hitti, *History of the Arabs*, London 1970, p. 142-43)

رومی اور ایرانی سلطنتوں کی باہمی رقابت نے دونوں کو شدید طور پر کمزور کر دیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف ہلاکت خیز جنگیں چھیڑ رکھی تھیں۔ یہ سلسلہ کئی نسلوں تک جاری رہا۔ اس کا خرچ پورا کرنے کے لیے رعایا پر بھاری ٹیکس لگائے گئے۔ جس کے نتیجے میں رعایا کی وفاداری اپنی حکومتوں کے ساتھ باقی نہ رہی۔ اس قسم کی چیزیں تھیں جنھوں نے عرب ہتھیاروں کو موقع دیا کہ وہ رومی اور ایرانی علاقوں میں تعجب خیز حد تک تیز کامیابی حاصل کر سکیں۔

مورخین نے عام طور پر اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ تاہم وہ اس کو ایک عام طبعی واقعہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ غیر معمولی واقعہ ایک خدائی منصوبہ تھا جو خاتم النبیین کی تائید کے لیے خصوصی طور پر ظاہر کیا گیا۔

ایک امریکی انسائیکلوپیڈیا میں "اسلام" کے عنوان سے جو مقالہ ہے اس میں عیسائی مقالہ نگار نے یہ الفاظ لکھے ہیں کہ اسلام کے ظہور نے انسانی تاریخ کے رخ کو بدل دیا:

Its advent changed the course of human history.

یہ ایک حقیقت ہے کہ صدرِ اول کے اسلامی انقلاب کے بعد انسانی تاریخ میں ایسی تبدیلیاں ہوئیں جو اس سے پہلے تاریخ میں کبھی نہیں ہوئی تھیں۔ اور ان تمام تبدیلیوں کی اصل یہ تھی کہ دنیا میں شرک کا تسلسل ختم ہو کر توحید کا تسلسل جاری ہوا۔ شرک تمام

برائیوں کی جڑ ہے اور توحید تمام خوبیوں کا سرچشمہ ہے۔ اس لیے جب یہ بنیادی واقعہ ہوا تو اسی کے ساتھ انسان کے اوپر تمام خوبیوں کا دروازہ بھی کھل گیا جو شرک کے غلبے کے سبب سے اب تک اس کے اوپر بند پڑا ہوا تھا۔

اب توہماتی دور ختم ہو کر علمی دور کا آغاز ہوا۔ انسانی امتیاز کی بنیاد ڈھ گئی اور اس کے بجائے انسانی مساوات کا زمانہ شروع ہوا۔ نسلی حکمرانی کی جگہ جمہوری حکمرانی کی بنیادیں پڑیں۔ مظاہر فطرت جو تمام دنیا میں پرستش کا موضوع بنے ہوئے تھے، پہلی بار تحقیق اور تسخیر کا موضوع قرار پائے، اور اس طرح حقائق فطرت کے کھلنے کا آغاز ہوا۔ یہ دراصل توحید ہی کا انقلاب تھا جس سے ان تمام انقلابات کی بنیاد پڑی جو بالآخر اس مشہور واقعہ کو پیدا کرنے کا سبب بنے جس کو جدید ترقی یافتہ دور کہا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم نے دعا فرمائی تھی:

وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ۔ رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيراً مِنَ النَّاسِ (14:35-36)۔ خدایا مجھ کو اور میری اولاد کو اس سے بچا کہ ہم بتوں کی عبادت کریں۔ خدایا، ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا۔

سوال یہ ہے کہ بتوں نے کس طرح لوگوں کو گمراہ کیا۔ بتوں (اصنام) میں وہ کون سی خصوصیت تھی، جس کی بنا پر وہ لوگوں کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کا راز اس وقت سمجھ میں آتا ہے جب یہ دیکھا جائے کہ حضرت ابراہیم کے زمانے میں وہ کون سے بت تھے جن کی بابت آپ نے یہ الفاظ فرمائے۔

یہ بت، سورج، چاند اور ستارے تھے۔ تاریخی طور پر ثابت ہے کہ حضرت ابراہیم

کے زمانے میں جو مہذب دنیا تھی اس میں ہر جگہ آسمان کے ان روشن اجرام کی پرستش ہوتی تھی جن کو سورج، چاند اور ستارے کہا جاتا ہے۔ اسی سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ بت کیوں کر لوگوں کو گمراہ کر پاتے تھے۔

خدا اگرچہ سب سے بڑی حقیقت ہے مگر وہ آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے برعکس، سورج، چاند اور ستارے ہر آنکھ کو جگمگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی جگمگاہٹ کی بنا پر لوگ ان کے فریب میں آ گئے اور ان سے متاثر ہو کر ان کو پوجنا شروع کر دیا۔ ان روشن اجسام کا غلبہ انسان کے ذہن پر اتنا زیادہ ہوا کہ وہی پوری انسانی فکر پر چھا گیا۔ حتیٰ کہ حکومتیں بھی انھیں کی بنیاد پر قائم ہونے لگیں۔ اس زمانے کے بادشاہ اپنے آپ کو سورج کی اولاد اور چاند کی اولاد بتا کر لوگوں کے اوپر حکومت کرنے لگے۔

پیغمبر آخر الزماں کے ذریعے توحید کو غالب کر کے اس دور کو ختم کیا گیا۔ اس وقت غلبہ توحید کا جو منصوبہ بنایا گیا اس کے دو خاص مرحلے تھے۔ پہلا مرحلہ وہ تھا جس کو قرآن میں وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (8:39) کہا گیا ہے۔ یعنی، ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سب اللہ کے لیے ہو جائے۔

اس آیت میں "فتنہ" سے مراد شرک جارح ہے۔ قدیم زمانے میں شرک کو جارحیت کا موقع اس لیے حاصل تھا کہ اس زمانے میں حکومت کی بنیاد شرک پر قائم ہو گئی تھی۔ شرک کو مکمل طور پر حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔ ایسی حالت میں جب توحید کی دعوت دی جاتی تو وقت کے حکمرانوں کو یہ محسوس ہونے لگتا کہ یہ دعوت ان کے حق حکمرانی کو مشتبہ کر رہی ہے۔ چنانچہ وہ توحید کے داعیوں کو کچلنے کے لیے کھڑے ہو

جاتے۔ قدیم زمانے میں اعتقادی جارحیت کا اصل سبب یہی تھا۔

رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو یہ حکم ہوا کہ علم بردارانِ شرک سے لڑو اور شرک کی اس حیثیت کا خاتمہ کردو کہ وہ داعیان توحید کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنا سکیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ تھا کہ شرک کا رشتہ سیاست سے کاٹ دیا جائے۔ شرک اور سیاست دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے یہ مہم پوری طاقت کے ساتھ شروع کی۔ ان کی کوششوں سے پہلے عرب میں شرک کا زور ٹوٹا۔ اس کے بعد قدیم آباد دنیا کے بیشتر علاقے میں مشرکانہ نظام کو مغلوب کرکے ہمیشہ کے لیے شرک کی جارحانہ حیثیت کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اب ہمیشہ کے لیے شرک الگ ہو گیا اور سیاسی اقتدار الگ۔

شرک کے اوپر توحید کے غلبہ کی مہم کا دوسرا مرحلہ وہ تھا جس کا ذکر قرآن کی اس آیت میں ملتا ہے: سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (41:53)۔ عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے آفاق میں بھی اور خود ان کے اندر بھی۔ یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ حق ہے۔

پہلے مرحلہ کا مطلب مظاہر فطرت سے سیاسی نظریہ اخذ کرنے کو ختم کرنا تھا۔ وہ ساتویں صدی عیسوی میں پوری طرح انجام پا گیا۔ دوسرے مرحلہ کا مطلب یہ تھا کہ مظاہر فطرت سے توہمات کے پردہ کو ہٹا دیا جائے اور اس کو علم کی روشنی میں لایا جائے۔ اس دوسرے مرحلہ کا آغاز دور نبوت سے ہوا اور اس کے بعد وہ موجودہ سائنسی انقلاب کی صورت میں تکمیل کو پہنچا۔

موجودہ دنیا خدا کی صفات کا ایک اظہار ہے۔ یہاں مخلوقات کے آئینے میں آدمی اس کے خالق کو پاتا ہے۔ وہ اس پر غور کر کے خدا کی قدرت اور عظمت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ مگر قدیم مشرکانہ افکار نے دنیا کی چیزوں کو پراسرار طور پر مقدس بنا رکھا تھا۔ ہر چیز کے بارے میں کچھ توہماتی عقائد بن گئے تھے اور یہ عقائد ان چیزوں کی تحقیق و جستجو میں مانع تھے۔ توحید کے انقلاب کے بعد جب تمام دنیا خدا کی مخلوق قرار پائی تو اس کے بارے میں تقدس کا ذہن ختم ہو گیا۔ اب دنیا کی ہر چیز کا بے لاگ مطالعہ کیا جانے لگا اور اس کی تحقیق شروع ہو گئی۔

اس تحقیق اور مطالعہ کے نتیجے میں چیزوں کی حقیقتیں کھلنے لگیں۔ دنیا کے اندر قدرت کا جو مخفی نظام کار فرما ہے وہ انسان کے سامنے آنے لگا۔ یہاں تک کہ جدید سائنسی انقلاب کی صورت میں وہ پیشن گوئی کامل صورت میں پوری ہو گئی جس کا ذکر اوپر کی آیت (حٰم السجدہ 41:53) میں ہے۔

جدید سائنسی مطالعہ نے کائنات کے جو حقائق انسان پر کھولے ہیں انھوں نے ہمیشہ کے لیے توہماتی دور کا خاتمہ کر دیا ہے۔ ان دریافت شدہ حقائق سے بیک وقت دو فائدے حاصل ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ دینی عقائد اب محض مدعیانہ عقائد نہیں رہے بلکہ خود علم انسانی کے ذریعہ ان کا برحق ہونا ایک ثابت شدہ چیز بن گیا ہے۔

دوسرے یہ کہ معلومات ایک مومن کے لیے اضافہ ایمان کا بے پناہ خزانہ ہیں۔ ان سائنسی دریافتوں کے ذریعہ کائنات کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ اگرچہ بہت جزئی ہے، تاہم وہ اتنا زیادہ حیرت ناک ہے کہ اس کو پڑھ کر اور جان کر آدمی کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوں۔ اس کا ذہن معرفت رب کی روشنی حاصل کرے۔ اس کی آنکھیں خدا کی

عظمت اور خوف سے آنسو بہانے لگیں۔وہ آدمی کو اس درجہ احسان تک پہنچادے جس کو حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4777)۔اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔

دورِ جدید میں احیاءِ اسلام

موجودہ زمانے میں تاریخ دوبارہ وہیں پہنچ گئی ہے جہاں وہ ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے دور میں پہنچی تھی۔ قدیم زمانے میں انسان کے اوپر شرک کا غلبہ اس طرح ہوا کہ تاریخ میں اس کا تسلسل قائم ہو گیا۔اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہر شخص جو انسانی نسل میں پیدا ہوتا وہ مشرک پیدا ہوتا۔اب پچھلے چند سو سال کے عمل کے نتیجے میں ملحدانہ افکار انسان کے اوپر غالب آ گئے ہیں۔ علم و عمل کے ہر شعبے میں الحادی طرز فکر اس طرح چھا گیا ہے کہ دوبارہ تاریخ انسانی میں الحاد کا تسلسل قائم ہو گیا ہے۔اب ہر شخص جو پیدا ہوتا ہے، خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں پیدا ہو، وہ ملحدانہ افکار کے زیرِ اثر پیدا ہوتا ہے۔الحاد آج کا غالب دین ہے۔اور اسلام کا احیا موجودہ زمانے میں اس وقت تک ممکن نہیں جب تک الحاد کو فکری غلبے کے مقام سے ہٹایا نہ جائے۔

موجودہ زمانہ میں احیاءِ اسلام کو ممکن بنانے کے لیے دوبارہ وہی دونوں طریقے اختیار کرنے ہیں جو پہلے غلبہ کے وقت اختیار کیے گئے تھے۔یعنی افراد کی تیاری، اور مخالفین حق کی مغلوبیت۔

پہلا کام ہم کو خود اپنے وسائل کے تحت انجام دینا ہے۔ جہاں تک دوسرے کام کا تعلق ہے، اس کو موجودہ زمانے میں دوبارہ خدا نے اسی طرح بہت بڑے پیمانے پر انجام دے دیا ہے جس طرح اس نے دورِ اول میں انجام دیا تھا۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ ان

پیدا شدہ مواقع کو استعمال کیا جائے۔

1۔ موجودہ زمانے میں احیا اسلام کی مہم کو کامیاب بنانے کے لیے سب سے پہلے افراد کار کی ضرورت ہے۔ گویا اب دوبارہ ایک نئے انداز سے وہی چیز درکار ہے جو حضرت ابراہیم کے منصوبہ میں مطلوب تھی۔ یعنی حقیقی معنوں میں ایک مسلم گروہ کی تیاری۔

موجودہ زمانے میں اسلامی احیا کی مہم چلانے کے لیے جو افراد درکار ہیں وہ عام قسم کے مسلمان نہیں ہیں بلکہ ایسے لوگ ہیں جن کے لیے اسلام ایک دریافت (discovery) بن گیا ہو۔ وہ واقعہ جو سب سے زیادہ کسی انسان کو متحرک کرتا ہے وہ یہی دریافت کا واقعہ ہے ۔جب آدمی کسی چیز کو دریافت کے درجہ میں پائے تو اچانک اس کے اندر ایک نئ شخصیت ابھر آتی ہے۔ یقین، حوصلہ، عزم، فیاضی، قربانی، اتحاد، غرض وہ تمام اوصاف جو کوئی بڑا کام کرنے کے لیے درکار ہیں، وہ سب دریافت کی زمین پر پیدا ہوتے ہیں۔

موجودہ زمانے میں مغربی اقوام میں جو اعلیٰ اوصاف پائے جاتے ہیں وہ سب اسی دریافت کا نتیجہ ہیں۔ مغربی قوموں نے روایتی دنیا کے مقابلے میں سائنسی دنیا کو دریافت کیا ہے۔ یہی دریافت کا احساس ہے جس نے مغربی قوموں میں وہ اعلیٰ اوصاف پیدا کر دیے ہیں جو آج ان کے اندر پائے جاتے ہیں۔

قرنِ اول میں اصحاب رسول کا معاملہ بھی یہی تھا۔ ان کو خدا کا دین بطور دریافت کے ملا تھا۔ انھوں نے جاہلیت کے مقابلے میں اسلام کو پایا تھا۔ انھوں نے شرک کے مقابلے میں توحید کو دریافت کیا تھا۔ ان پر دنیا کے مقابلے میں آخرت کا انکشاف ہوا تھا۔ یہی چیز تھی جس نے ان کے اندر وہ غیر معمولی اوصاف پیدا کر دیے جن کو آج ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں۔ آج

اگر اسلامی احیا کی مہم کو موثر طور پر چلانا ہے تو دوبارہ ایسے انسان پیدا کرنے ہوں گے جنھیں اسلام دریافت کے طور پر ملا ہو، نہ کہ محض نسلی وراثت کے طور پر۔

2۔ اسلام چودہ سو سال پہلے شروع ہوا۔ اس کے بعد اس کی تاریخ بنی، تمدنی عظمت اور سیاسی فتوحات کی تاریخ۔ آج جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، وہ اسی تاریخ کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں۔ جس قوم کی بھی یہ صورت حال ہو، وہ ہمیشہ قریبی تاریخ میں اٹک کر رہ جاتی ہے۔ وہ تاریخ سے گزر کر ابتدائی اصل تک نہیں پہنچتی۔ یہی معاملہ آج مسلمانوں کا ہے۔ موجودہ زمانے کے مسلمان شعوری یا غیر شعوری طور پر، اپنا دین تاریخ سے اخذ کر رہے ہیں، نہ کہ حقیقتاً قرآن اور سنت رسول سے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام آج کے مسلمانوں کے لیے فخر کی چیز بنا ہوا ہے، نہ کہ ذمہ داری کی چیز۔ ان کے افکار و اعمال میں یہ نفسیات اس قدر رچ بس گئی ہے کہ ہر جگہ اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ اسلام کو قرآن و سنت میں دیکھئے تو وہ سراسر ذمہ داری اور مسئولیت کی چیز نظر آئے گا۔ اس کے برعکس، اسلام کو جب اس کی تمدنی تاریخ اور سیاسی واقعات کے آئینہ میں دیکھا جائے تو وہ فخر اور عظمت کی چیز معلوم ہونے لگتا ہے۔ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کی تمام بڑی بڑی انقلابی تحریکیں اسی جذبۂ فخر کے تحت اٹھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ وقتی ہنگامے پیدا کر کے ختم ہو گئیں۔ کیوں کہ فخر کا جذبہ نمائش اور ہنگامے کی طرف لے جاتا ہے۔ اور مسئولیت کا جذبہ حقیقی اور سنجیدہ عمل کی طرف۔

اسلامی احیا کی مہم کو موثر طور پر چلانے کے لیے وہ افراد درکار ہیں جنھوں نے اسلام کو قرآن و حدیث کی ابتدائی تعلیمات سے اخذ کیا ہو، نہ کہ بعد کو بننے والی تمدنی اور سیاسی تاریخ

سے۔ قرآن و حدیث سے دین کو اخذ کرنے والے لوگ ہی سنجیدگی اور احساس ذمہ داری کے تحت کوئی حقیقی مہم چلا سکتے ہیں۔ اس کے بر عکس، جو لوگ تاریخ سے اپنا دین اخذ کریں وہ صرف اپنے فخر کا جھنڈا بلند کریں گے۔ وہ کسی نتیجہ خیز عمل کا ثبوت نہیں دے سکتے۔ مسلمان موجودہ زمانے میں ایک شکست خوردہ قوم بنے ہوئے ہیں۔ پوری مسلم دنیا پر ایک قسم کا احساس مظلومی (persecution complex) چھایا ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہی تاریخ سے دین کو اخذ کرنا ہے۔ ہم نے تاریخی عظمت کو دین سمجھا۔ ہم نے "لال قلعہ" اور "غرناطہ" میں اپنی اسلامیت کا تشخص دریافت کیا۔ چوں کہ موجودہ زمانے میں دوسری قوموں نے ہم سے یہ چیزیں چھین لیں، اس لیے ہم فریاد و ماتم میں مشغول ہو گئے۔ اگر ہم ہدایت ربّانی کو دین سمجھتے تو ہم کبھی بھی احساس محرومی کا شکار نہ ہوتے۔ کیوں کہ وہ ایسی چیز ہے جس کو کوئی طاقت ہم سے کبھی چھین نہیں سکتی۔ ہم نے چھن جانے والی چیزوں کو اسلام سمجھا۔ اس لیے جب وہ چھن گئی تو ہم شکایت اور محرومی کا پیکر بن کر رہ گئے۔ اگر ہم نہ چھننے والی چیز کو اسلام سمجھتے تو ہمارا کبھی وہ حال نہ ہوتا جو آج ہر طرف نظر آرہا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ جو زیادہ بڑی چیز ہمارے پاس ابھی تک بغیر چھنی ہوئی محفوظ ہے، اس کا ہمیں شعور نہیں۔ اور جو چھوٹی چیز ہم سے چھن گئی ہے اس کے لیے ہم شکایت اور احتجاج میں مصروف ہیں۔

اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ساری دنیا میں مسلمان دوسری قوموں سے لڑائی جھگڑے میں مصروف ہیں۔ وہ اسلام کو اپنی قومی عظمت کا نشان سمجھتے ہیں۔ اس لیے جو لوگ انھیں اس عظمت کو چھینتے ہوئے نظر آتے ہیں ان کے خلاف وہ لڑنے کے لیے کھڑے ہو گئے

ہیں۔ کہیں یہ لڑائی الفاظ کے ذریعہ ہو رہی ہے اور کہیں ہتھیاروں کے ذریعہ۔ اس صورت حال نے مسلمانوں کے پورے رویہ کو منفی بنا دیا ہے۔ اسلام اگر ان کو ربانی ہدایت کے طور پر ملتا تو وہ محسوس کرتے کہ ان کے پاس دوسری قوموں کو دینے کے لیے کوئی چیز ہے۔ وہ اپنے کو دینے والا سمجھتے اور دوسرے کو لینے والا۔ جب کہ موجودہ حالت میں وہ سمجھتے ہیں کہ وہ چھنے ہوئے لوگ ہیں اور دوسرے چھیننے والے لوگ۔ ہمارے اور دوسری قوموں کے درمیان حقیقی رشتہ داعی اور مدعو کا رشتہ ہے۔ مگر تاریخی اسلام کو اسلام سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسری قومیں ہمارے لیے صرف حریف اور رقیب بن کر رہ گئی ہیں۔ ہمارے اور دوسری قوموں کے درمیان جب تک یہ حریفانہ فضا باقی ہے، اسلامی احیا کا کوئی حقیقی کام شروع نہیں کیا جا سکتا۔

پہلے ہی مرحلہ میں ایسا نہیں ہو سکتا کہ تمام مسلمانوں کو حریفانہ نفسیات سے پاک کر دیا جائے۔ مگر کم سے کم ایک ایسی ٹیم کا ہونا ضروری ہے جس کے افراد اپنی حد تک اس ذہنی فضا سے نکل چکے ہوں۔ جن کے اندر ایسی فکری تبدیلی آ چکی ہو کہ دوسری قوموں کو وہ اپنا مدعو سمجھیں، نہ کہ مادی حریف اور قومی رقیب۔ یہ بظاہر سادہ سی بات انتہائی مشکل بات ہے۔ اس کے لیے اپنے آپ کو ذبح کرنا پڑتا ہے۔ اپنے اور دوسری قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ قائم کرنے کی لازمی شرط یہ ہے کہ ہم یک طرفہ طور پر تمام شکایتوں کو بھلا دیں۔ ہر قسم کے مادی نقصانات کو گوارا کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ داعی اور مدعو کا رشتہ داعی کی طرف سے یک طرفہ قربانی پر قائم ہوتا ہے۔ اور موجودہ دنیا میں بلاشبہ یہ سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔

یہ اور اس طرح کے دوسرے اوصاف ہیں جو ان لوگوں میں ہونا ضروری ہیں جو

موجودہ زمانہ میں احیا اسلام کی مہم کے لیے اٹھیں۔ ایسے افراد تیار کرنے کے لیے موجودہ زمانے میں دوبارہ اسی قسم کا ایک منصوبہ درکار ہے جو دور اول میں خیر امت کے اخراج (آل عمران، 3:110) کے لیے زیر عمل لایا گیا تھا۔ موجودہ زمانے کے اعتبار سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج یہ ضرورت ہے کہ جدید طرز کی ایک اعلیٰ تربیت گاہ قائم کی جائے۔ یہ تربیت گاہ تمدنی ماحول سے الگ قدرت کی بے آمیز فضا میں قائم ہونی چاہیے۔ یہ تربیت گاہ گویا دوبارہ قوم کے کچھ اعلیٰ افراد کو وادیِ غیرِ ذی زرع میں بسانے کے ہم معنی ہو گی۔

مذکورہ تربیت گاہ کو کامیاب طور پر چلانے کے لیے کچھ ایسے ابراہیمی والدین درکار ہیں جو اپنی اولاد کو ذبح کرنے کے لیے تیار ہوں۔ وہ اس پر راضی ہو جائیں کہ ان کی ذہین اولاد کو وقت کے اعلیٰ معاشی مواقع سے محروم کر کے ایک ایسے ماحول میں ڈال دیا جائے جہاں سب کچھ دے کر بھی تعلق باللہ اور فکر آخرت کے سوا کوئی اور چیز نہ ملتی ہو۔ اس طرح کی ایک تربیت گاہ، فلپ ہٹی کے مذکورہ الفاظ میں، دوبارہ ایک قسم کی "نرسری آف ہیروز" بنانے کے ہم معنی ہو گی۔ جب تک اس قسم کے افراد کی ایک قابل لحاظ ٹیم تیار نہ ہو جائے، احیا اسلام کی جانب کوئی حقیقی قدم نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اس قسم کی تربیت گاہ کا قیام گویا جدید زمانہ کے لحاظ سے اس آیت قرآنی کی تعمیل ہو گی:

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ
اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ (9:122)۔ ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر
گروہ میں سے ایک حصہ نکل کر آتا، تاکہ وہ دین میں گہری سمجھ پیدا کرتا اور

واپس جاکر اپنی قوم کے لوگوں کو آگاہ کرتا تاکہ وہ بھی پرہیز کرنے والے بنتے۔

یعنی قوم کے کچھ ذہین افراد کو عام ماحول سے الگ کر کے ایک علاحدہ ماحول میں لایا جائے اور وہاں متعین مدت تک خصوصی تعلیم و تربیت کے ذریعہ انھیں اس کے لیے تیار کیا جائے کہ وہ موجودہ زمانہ میں احیا اسلام کی مہم کو کامیابی کے ساتھ چلا سکیں۔ وہ اہل عالم کے لیے منذر اور مبشر بن سکیں۔

دور اول میں اسلامی انقلاب کو ممکن بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص اہتمام یہ کیا کہ ایران اور روم کی سلطنتیں جو اس زمانہ میں دین توحید کی سب سے بڑی حریف تھیں، ان کو باہم ٹکرا کر اتنا کمزور کر دیا کہ اہل اسلام کے لیے ان کو مغلوب کرنا آسان ہو گیا۔

خدا کی یہی مدد موجودہ زمانہ کے اہل ایمان کے لیے ایک اور شکل میں ظاہر ہوئی ہے۔ اور وہ ہے کائنات کے بارے میں ایسی معلومات کا سامنے آنا جو دینی حقیقتوں کو معجزاتی سطح پر ثابت کر رہی ہیں۔ قدیم زمانے میں توہماتی طرزِ فکر کا غلبہ تھا، اس بنا پر عالم کائنات کے بارے میں انسان نے عجیب عجیب بے بنیاد رائیں قائم کر رکھی تھیں۔ کائنات کو قرآن میں آلاءِ رب (کرشمۂ خدا) کہا گیا ہے (55:30)۔ مگر یہ خدائی کرشمہ توہماتی مفروضوں کے پردہ میں چھپا ہوا تھا۔ دور اول کے اسلامی انقلاب کے نتائج میں سے ایک نتیجہ یہ ہے کہ مظاہر فطرت جو اس سے پہلے پرستش کا موضوع بنے ہوئے تھے وہ انسان کے لیے تحقیق و تسخیر کا موضوع بن گئے۔ اس طرح تاریخ انسانی میں پہلی بار واقعاتِ فطرت کا خالص علمی انداز میں جاننے کا ذہن پیدا ہوا۔ یہ ذہن مسلسل بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ یورپ پہنچا۔ یہاں ترقی پا کر وہ اس انقلاب کا سبب بنا جس کو موجودہ زمانہ میں سائنسی انقلاب کہا جاتا ہے۔

سائنس نے گویا توہماتی پردے کو ہٹا کر کرشمۂ خدا کا کرشمۂ خدا ہونا ثابت کر دیا۔ اس نے مظاہر فطرت کو "معبود" کے مقام سے ہٹا کر "مخلوق" کے مقام پر رکھ دیا۔ حتیٰ کہ یہ نوبت آئی کہ چاند جس کو قدیم انسان معبود سمجھ کر پوجتا تھا، اس پر اس نے اپنے پاؤں رکھ دیے اور وہاں اپنی مشینیں اتار دیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ سائنس نے جو نئے دلائل فراہم کیے ہیں، ان کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے تو دین توحید کی دعوت کو اس برتر سطح پر پیش کیا جا سکتا ہے، جس کے لیے اس سے پہلے معجزات ظاہر کیے جاتے تھے۔

زمین و آسمان میں جو چیزیں ہیں وہ اس لیے ہیں کہ ان کو دیکھ کر آدمی خدا کو یاد کرے۔ مگر انسان نے خود انھیں چیزوں کو خدا سمجھ لیا۔ یہ ایک قسم کا انحراف تھا۔ اسی قسم کا انحراف موجودہ زمانے میں سائنسی معلومات کے بارے میں پیش آرہا ہے۔ سائنسی تحقیق سے جو حقائق سامنے آئے ہیں وہ سب خدا کی خدائی کا ثبوت ہیں۔ وہ انسان کو خدا کی یاد دلانے والے ہیں۔ مگر موجودہ زمانے کے ملحد مفکرین نے دوبارہ ایک انحراف کیا۔ انھوں نے سائنسی حقیقتوں کو غلط رخ دے کر یہ کیا کہ جس چیز سے خدا کا ثبوت نکل رہا تھا اس کو انھوں نے اس بات کا ثبوت بنا دیا کہ یہاں کوئی خدا نہیں ہے۔ بلکہ سارا نظام ایک مشینی عمل کے تحت اپنے آپ چلا جا رہا ہے۔

سائنس نے جو کائنات دریافت کی ہے وہ ایک حد درجہ بامعنی اور بامقصد کائنات ہے۔ جدید دریافتوں نے ثابت کیا ہے کہ ہماری دنیا منتشر مادہ کا بے معنی انبار نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک اعلیٰ درجہ کا منظم کارخانہ ہے۔ دنیا کی تمام چیزیں بے حد ہم آہنگی کے ساتھ ایک ایسے رخ پر سفر کرتی ہیں جو ہمیشہ بامقصد نتائج پیدا کرنے والے ہوں۔ کائنات میں نظم اور

مقصدیت کی دریافت واضح طور پر ناظم کی موجودگی کا اقرار ہے۔ وہ کائنات کے پیچھے خدائی کارفرمائی کا یقینی ثبوت ہے۔ مگر موجودہ زمانے کے بے خدا مفکرین نے یہ کیا کہ اس سائنسی دریافت کارخ الحاد کی طرف موڑ دیا۔ انھوں نے کہا کہ جو کچھ ثابت ہوا ہے وہ بجائے خود واقعہ ہے۔ مگر اس کا کیا ثبوت کہ وہ کوئی نتیجہ (end) ہے۔ عین ممکن ہے کہ وہ محض ایک اثر (effect) ہو۔ یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ یہاں کوئی ذہن ہو جو شعور اور ارادے کے تحت بالقصد واقعات کو ایک خاص انجام کی طرف لے جا رہا ہو۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ واقعات کے بے شعور عمل کے اثر سے اپنے آپ ایک چیز برآمد ہو رہی ہو جو اتفاق سے بامعنی بھی ہو۔ یہ بے معنی توجیہ خود ایک ارادہ کے تحت وجود میں آئی ہے۔ پھر کیسی عجیب بات ہے کہ کائنات کو بلاارادہ کارفرمائی مان لیا جائے۔

ایک طرف سائنس کے ظہور کے بعد ملحد مفکرین نے بہت بڑے پیمانے پر سائنس کو الحاد کارخ دینے کی کوشش کی ہے۔ دوسری طرف اس کے مقابلے میں مذہبی مفکرین کی کوششیں اتنی ہی کم ہیں۔ پچھلے سو سال کے اندر ایک طرف ہزاروں کی تعداد میں اعلیٰ علمی کتابیں چھپی ہیں جن کے ذریعہ سائنس سے غلط طور پر الحاد کو برآمد کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسری طرف دینی مفکرین کی صف میں چند ہی قابل ذکر علمی کوششوں کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ایک قابل قدر کتاب سر جیمز جینز کی پراسرار کائنات (*The Mysterious Universe*) ہے۔ اس کتاب میں لائق مصنف نے نظریہ تعلیل (Principle of Causation) کو خالص سائنسی استدلال کے ذریعہ منہدم کر دیا ہے جس کو موجودہ زمانہ میں خدا کا مشینی بدل سمجھ لیا گیا تھا۔

موجودہ صدی کے نصف آخر میں بے شمار نئے حقائق انسان کے علم میں آئے ہیں جو نہایت برتر سطح پر دینی عقائد کی حقانیت کو ثابت کر رہے ہیں۔ مگر ابھی تک کوئی ایسا دینی مفکر سامنے نہیں آیا جو ان سائنسی معلومات کو دینی صداقتوں کے اثبات کے طور پر مدون کرے۔ اگر یہ کام اعلیٰ سطح پر ہو سکے تو وہ دعوت توحید کے حق میں ایک علمی معجزہ ظاہر کرنے کے ہم معنی ہو گا۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ماضی میں جتنے پیغمبر آئے سب کی پیغمبری پر ان کے ہم عصر مخاطبین نے شک کیا (ہود، 11:62)۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی ابتدا میں یہی صورت پیش آئی کہ آپ کے مخاطبینِ اول آپ کی نبوت پر شک کرتے رہے (ص، 38:8)۔ تاہم اسی کے ساتھ قرآن میں یہ اعلان کیا گیا کہ آپ کو مقام محمود پر کھڑا کیا جائیگا: عَسٰٓی اَنۡ یَّبۡعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا (17:79)۔ اس اعلان کا مطلب یہ تھا کہ آپ کی نبوت شک کے مرحلے سے گزر کر ایک ایسے مرحلے میں پہنچے گی جب وہ مکمل طور پر تسلیم شدہ نبوت بن جائے۔ محمود (قابل تعریف) ہونا تسلیم واعتراف کا آخری درجہ ہے۔

ہر نبی جب پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنی قوم کے اندر ایک ایسی شخصیت ہوتا ہے جس کو لوگ شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ "معلوم نہیں یہ واقعتاً پیغمبر ہیں یا صرف دعویٰ کر رہے ہیں" اس طرح کے خیالات لوگوں کے ذہن میں گھومتے ہیں اور آخر وقت تک ختم نہیں ہو پاتے۔ پیغمبری اپنے ابتدائی دور میں صرف دعویٰ ہوتی ہے۔ وہ اپنے دعویٰ کا ایسا ثبوت نہیں ہوتی جس کو ماننے پر لوگ مجبور ہو جائیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب بھی کوئی پیغمبر آیا وہ اپنی قوم کی نظر میں ایک نزاعی شخصیت بن

گیا۔ کیونکہ پیغمبر کی صداقت کو جاننے کے لیے لوگوں کے پاس اس وقت اس کا صرف دعویٰ تھا۔اس کے حق میں مسلمہ تاریخی دلائل ابھی جمع نہیں ہوئے تھے۔اس قسم کے دلائل ہمیشہ بعد کو وجود میں آتے ہیں۔ مگر عام طور پر انبیاء کا معاملہ اس کے بعد کے مرحلے تک پہنچ نہ سکا۔

دوسرے پیغمبر نزاعی دور میں شروع ہوئے اور نزاعی دور ہی میں ان کا اختتام ہو گیا۔ کیونکہ ان کے بعد ان کے پیغام کی پشت پر ایسا گروہ جمع نہ ہو سکا جو ان کی سیرت اور ان کے کلام کو مکمل طور پر محفوظ رکھ سکے۔دوسرے انبیاء اپنے زمانے میں لوگوں کے لیے اس لیے نزاعی تھے کہ وہ ابھی اپنی تاریخ کے آغاز میں تھے،بعد کے دور میں وہ دوبارہ نزاعی ہو گئے۔ کیوں کہ بعد کو ان کی جو تاریخ بنی وہ انسانی علم کے معیار پر تسلیم شدہ نہ تھی۔

نبیوں کی فہرست میں اس اعتبار سے صرف پیغمبر آخر الزماں کا استثنا ہے۔آپ نے اگرچہ دوسرے نبیوں کی طرح، اپنی نبوت کا آغاز نزاعی دور سے کیا۔ مگر بعد کے دور میں آپ کو اتنی غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی کہ زمین کے بڑے حصے میں آپ کا اور آپ کے ساتھیوں کا اقتدار قائم ہو گیا۔ایک صدی سے بھی کم عرصہ میں آپ کے دین نے ایشیا اور افریقہ کی بڑی طاقتوں کو زیروزبر کر ڈالا۔

پیغمبر آخر الزماں کو جتنے چیلنج پیش آئے سب میں وہ فاتح رہے۔آپ نے جتنی پیشین گوئیاں کیں سب مکمل طور پر پوری ہوئیں۔جو طاقت بھی آپ سے ٹکرائی وہ پاش پاش ہو گئی۔ آپ کی زندگی میں ایسے واقعات پیش آئے جن کی بنا پر معاصر تاریخ میں آپ کا ریکارڈ قائم ہو گیا۔ ساری تاریخِ انبیاء میں آپ کو یہ غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی کہ آپ کی نبوت نزاعی مرحلے سے نکل کر محمودی مرحلے میں پہنچ گئی۔آپ کا کلام اور آپ کا کارنامہ

دونوں اس طرح محفوظ حالت میں باقی رہے کہ کسی کے لیے آپ کے بارے میں شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

موجودہ زمانے میں دین حق کے داعیوں کو ایک ایسا خصوصی موقع (advantage) حاصل ہے جو تاریخ کے پچھلے ادوار میں کسی داعی گروہ کو حاصل نہ تھا۔ وہ یہ کہ ہم آج اس حیثیت میں ہیں کہ توحید کی دعوت کو مسلّمہ (established) نبوت کی سطح پر پیش کر سکیں۔ جب کہ اس سے پہلے توحید کی دعوت صرف نزاعی (controversial) نبوت کی سطح پر پیش کی جاسکتی تھی۔

دوسری امتیں اگر نبوتِ نزاعی کی وارث تھیں تو ہم نبوت محمودی کے وارث ہیں۔ مسلمانوں کو اقوام عالم کے سامنے شہادت حق کا جو کام انجام دینا ہے، اس کے لیے خدا نے آج ہر قسم کے موافق مواقع مکمل طور پر کھول دیے ہیں۔ اس کے باوجود اگر مسلمان اس کار شہادت کو انجام نہ دیں، یا شہادت دین کے نام پر قومی جھگڑے کھڑے کرنے لگیں تو مجھے نہیں معلوم کہ قیامت کے دن وہ ربّ العالمین کے سامنے کیوں کر بریٔ الذمہ ہو سکتے ہیں۔[3]

---

[3] نومبر 1983ء کے آخری ہفتہ میں لاہور میں قرآنی سیمینار ہوا۔ اس موقع پر راقم الحروف کو ایک مقالہ پڑھنے کی دعوت دی گئی۔ زیرِ نظر مقالہ اسی سیمینار میں پیش کرنے کے لیے تیار کیا گیا۔

کائنات کی گواہی

سورہ الانعام میں منکرین کے اس مطالبہ کا ذکر ہے کہ وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے ہیں کہ اگر تم اپنے اس وعدے میں سچے ہو کہ جو پیغام تم لائے ہو وہ خدا کی طرف سے ہے تو کوئی معجزہ دکھاؤ۔ فرمایا کہ ایمان کا مدار معجز نما واقعات پر نہیں ہے بلکہ اس پر ہے کہ آدمی کی آنکھ کھلی ہوئی ہو اور وہ نشانیوں سے سبق لینا جانتا ہو۔ جس میں یہ صلاحیت زندہ ہو، اس کو نظر آئے گا کہ یہاں وہ معجزہ پہلے سے نہایت وسیع پیمانہ پر موجود ہے جس کا وہ مطالبہ کر رہا ہے۔ آخر اس سے بڑا معجزہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ ساری کائنات اپنے تمام اجزاء سمیت اس پیغام کی سچائی کی تصدیق کر رہی ہے جس کی طرف خدا کا رسول بلا رہا ہے۔ اور اگر آدمی نے اپنے آپ کو اندھا بنا رکھا ہو، وہ واقعات سے سبق لینے کی کوشش نہ کرتا ہو تو بڑے سے بڑا معجزہ بھی کارآمد نہیں ہو سکتا (6:35-40)۔

اس سلسلے میں ان دیگر مخلوقات (چڑیوں اور جانوروں) کی مثال دی گئی ہے جو اس دنیا میں انسان کے سوا پائی جاتی ہیں۔ دوسری جگہ زمین و آسمان کو بھی اس مثال میں شامل کیا گیا ہے (بنی اسرائیل، 17:44)۔ یعنی اگر تم غور کرو تو تمہارے لیے کافی سامان عبرت و نصیحت کا ان کے اندر موجود ہے۔ کیوں کہ یہ سب بھی تمہاری طرح مخلوقات ہیں۔ ان کو بھی اپنی زندگی میں ایک ڈھنگ اختیار کرنا ہے جس طرح تم کو اختیار کرنے کے لیے کہا جا رہا ہے۔

مگر تمہارے مقابلے میں، عالم موجودات کا بے حد بڑا حصہ ہونے کے باوجود، ان کا

معاملہ مکمل طور پر تم سے مختلف ہے۔ وہ ایک ہی مقررہ نقشہ پر کروڑوں برس سے چل رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اپنے مقرر نقشہ سے ادنیٰ انحراف نہیں کرتا۔ یہ صرف انسان ہے جو ایک مقرر نقشہ کو قبول نہیں کرتا۔ ہر آدمی چاہتا ہے کہ وہ اپنی من مانی راہوں پر دوڑتا رہے۔

رسول کا مطالبہ تم سے کیا ہے۔ یہی تو ہے کہ اس دنیا کا ایک خالق و مالک ہے۔ تمہارے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ تم خود سری اور خود رائی کو چھوڑ دو اور اپنے خالق و مالک کے تابع ہو جاؤ۔ غور کرو تو اس دعوت کے حق ہونے پر تمام زمین و آسمان اور تمام حیوانات گواہی دے رہے ہیں (النور، 24:41)۔ کیونکہ جس دنیا میں تم ہو جب اس کا وسیع تر حصہ خود سری کے بجائے پابندی کا طریقہ اختیار کیے ہوئے ہے تو تم اس کا بے حد مختصر حصہ ہو کر اس کے خلاف رویّہ اپنانے میں حق بجانب کیسے ہو سکتے ہو۔

عظیم الشان کائنات کا ہر جز خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، وہی کر رہا ہے جو اسے کرنا چاہیے۔ سب اپنے ایک ہی متعین راستہ پر اتنی صحت کے ساتھ چلے جا رہے ہیں کہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی عزیز و علیم نے ان کو بزور اس کا پابند کر رکھا ہے (یٰس، 36:38)۔ اتنی بڑی کائنات میں انسان کا الگ راستہ اختیار کرنا بتا رہا ہے کہ انحراف انسان کی طرف ہے، نہ کہ بقیہ کائنات کی طرف (آل عمران، 3:83)۔

ساری کائنات اپنے لاتعداد اجزاء کے ساتھ انتہائی متوافق طور پر (proportionately) حرکت کرتی ہے۔ ان میں کبھی باہم ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ یہ صرف انسان ہے جو آپس میں ٹکراؤ کرتا ہے۔ تمام کائنات اپنی ناقابل قیاس سرگرمیوں کے ساتھ ہمیشہ نفع بخش انجام کی طرف جاتی ہے۔ مگر انسان ایسی کارروائیاں کرتا ہے جو تباہی اور

بربادی پیدا کرنے والی ہوں۔

دو قسم کے پانی اپنی اپنی حد مقرر کیے ہوئے ہیں۔ایک دوسرے کی حد کو نہیں توڑتا۔ حتیٰ کہ سانڈوں کا گروہ بھی اپنے اپنے حدود کو متعین کرلیتا ہے۔ ہر سانڈ اپنی حد کے اندر کھاتا پیتا ہے، دوسرے سانڈ کی حد میں نہیں گھستا۔ مگر انسان کسی حد بندی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ شہد کی مکھیاں حد درجہ نظم اور تقسیم کار کے ساتھ اپنی تعمیری سرگرمیاں انجام دیتی ہیں۔ مگر انسان نظم و ضبط کو توڑتا ہے۔ چیونٹیاں اور چڑیاں رزق کی فراہمی میں اپنی محنت پر بھروسہ کرتی ہیں۔ وہ کسی سے چھین جھپٹ نہیں کرتیں، مگر انسان دوسرے انسان کا استحصال کرتا ہے۔ کوئی شیر یا بھیڑیا اپنی نوع کے جانور کو نہیں پھاڑتا۔ مگر انسان انسان کا خون بہاتا ہے۔ کوئی جانور حتیٰ کہ سانپ بچھو بھی بلاوجہ کسی کے اوپر حملہ نہیں کرتے۔ وہ حملہ کرتے ہیں تو صرف اپنے بچاؤ کے لیے۔ مگر انسان دوسرے انسانوں کے اوپر یک طرفہ جارحانہ کاروائیاں کرتا ہے۔ تمام جانور بقدر ضرورت کھاتے ہیں۔ بقدر ضرورت جنسی تعلقات قائم کرتے ہیں اور بقدر ضرورت گھر بناتے ہیں۔ مگر انسان ہر چیز میں اسراف اور بے راہ روی اور غیر ضروری تکلّفات کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔

تمام جانور صرف اپنے دائرہ کار میں اپنے کو مصروف رکھتے ہیں۔ مگر انسان اپنے دائرہ عمل کو چھوڑ کر دوسرے کے دائرہ میں مداخلت کرتا ہے۔ ایک چرواہے کی پچاس بکریاں جنگل میں چرتے ہوئے ہزاروں بھیڑ بکریوں سے مل جائیں اور اس کے بعد ان کا چرواہا ایک مقام پر کھڑے ہو کر آواز دے تو اس کی تمام بکریاں نکل نکل کر اس کے پاس آجاتی ہیں۔ مگر انسان کا حال یہ ہے کہ اس کو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بلایا جائے تو وہ

سننے اور سمجھنے کے بعد بھی اس پکار کی طرف نہیں دوڑتا۔

انسان ساری کائنات کا اس سے بھی کہیں زیادہ چھوٹا حصہ ہے جتنا پوری زمین کے مقابلہ میں سرسوں کا ایک دانہ۔ پھر انسان کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ کیسے درست ہو سکتا ہے جو وسیع تر کائنات کا راستہ ہے۔ اگر اتنی عظیم الشان دلیل کے باوجود آدمی اپنے لیے الگ راستے کا انتخاب کرتا ہے تو موجودہ کائنات میں وہ اپنے آپ کو بے استحقاق ثابت کر رہا ہے۔ اس کے بعد اس کا انجام صرف یہی ہو سکتا ہے کہ اس کو کائنات میں بے جگہ کر دیا جائے۔ کائنات کی تمام چیزیں اس کے ساتھ مساعدت کرنے سے انکار کر دیں۔ تمام کائناتی نعمتوں کو اس سے چھین کر اس کو ابدی محرومی میں ڈال دیا جائے۔

آدمی جس کائنات کا ہم سفر بننے کے لیے تیار نہیں، اس کو کیا حق ہے کہ اس کائنات کی چیزوں سے فائدہ اٹھائے۔ اس کے بعد بالکل فطری طور پر یہ انجام ہونا چاہیے کہ کائنات کو اس کی تمام نعمتوں کے ساتھ صرف ان انسانوں کو دے دیا جائے جو اس کے ہم سفر بنے، جنہوں نے اپنے خالق و مالک کی تابعداری اسی طرح کی جس طرح ساری کائنات کر رہی تھی۔ اس کے سوا وہ انسان جنہوں نے بغاوت اور خودرائی کا طریقہ اختیار کیا، ان کو نہ اس دنیا کی روشنی میں حصہ دار بننے کا حق ہے اور نہ اس کی ہوا اور پانی میں۔ وہ اس دنیا میں نہ اپنے لیے مکان بنانے کا حق رکھتے اور نہ کھانے اور آرام کرنے کا۔

انصاف کا تقاضا ہے کہ کائنات اپنے جنتی امکانات کے ساتھ صرف پہلے گروہ کے حصے میں آئے اور دوسرے گروہ کو یہاں کی تمام بہترین چیزوں سے محروم کر کے چھوڑ دیا جائے۔

اسلام کا اخلاقی تصور

اخلاقیات کا موضوع مذہب اور فلسفہ دونوں کا مشترک موضوع ہے۔ مگر دونوں کے طریق بحث میں ایک بنیادی فرق ہے۔ مذہب اخلاقی اصولوں کو بطور خدائی حکم کے پیش کرتا ہے۔ جب کہ فلسفہ "کیا" کے ساتھ "کیوں" کے سوال کی تحقیق بھی کرنا چاہتا ہے۔ یعنی یہ کہ ایک چیز اخلاقی طور پر درست ہے تو وہ کیوں درست ہے۔ اسی طرح ایک چیز اخلاقی طور پر نادرست ہے تو کیوں نادرست ہے۔

اس اختلاف نے دونوں کے درمیان ایک عظیم فرق پیدا کر دیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ مذہب میں اخلاق ایک معلوم اور متعین چیز کا نام ہے جس میں بنیادی طور پر کسی اختلاف کی گنجائش نہیں۔ اس کا خدا کا حکم ہونا اس کو ایک قطعی صورت دے دیتا ہے۔ اس کے برعکس، فلسفہ میں چوتھی صدی قبل مسیح کے یونانی فلسفیوں سے لے کر بیسویں صدی کے جدید مغربی فلسفیوں تک لامتناہی بحثیں جاری ہیں اور آج تک یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ انسانی عمل کے لیے اخلاقی معیار (criteria of ethics) کیا ہونا چاہیے۔ ہر فلسفی نے اپنا ایک مدرسۂ فکر بنادیا مگر وہ دنیا کو کوئی مسلّمہ اصول اخلاق نہ دے سکا۔

ہمارا نقطہ نظر یہ ہے انسانی محدودیتیں (limitations) اس میں حائل ہیں کہ انسان "کیوں" کے سوال کو حل کر سکے۔ چنانچہ ہم نے فلسفیانہ بحثوں کے بجائے عملی نقطۂ نظر اختیار کیا ہے۔ اس مقالہ میں ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ اسلام میں اخلاق کا جو اصولی اور بنیادی تصور دیا گیا ہے اس کو سادہ انداز میں بیان کریں۔

کائنات کی سطح پر

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ خدا نے سات آسمان اوپر تلے پیدا کیے۔ تم خدا کی تخلیق میں کوئی خلل نہ دیکھو گے۔ تم پھر نگاہ ڈال کر دیکھو، کہیں تم کو کوئی خلل نظر آتا ہے۔ تم دوبارہ نگاہ ڈال کر دیکھ لو۔ آخر کار تمہاری نگاہ حقیر اور عاجز ہو کر تمہاری طرف لوٹ آئے گی (67:3-4)۔

خدا نے ایک عظیم کائنات پیدا کی۔ اس کائنات میں ہر آن بے شمار سرگرمیاں جاری ہیں۔ مگر تمام سرگرمیاں نہایت منظم طور پر ہو رہی ہیں۔ کہیں کوئی بے قاعدگی نہیں۔ کسی کا عمل یہاں اعلیٰ معیار سے کم نہیں۔

اخلاق خداوندی

انسان کو خدا نے اس نظام کی پابندی سے بظاہر آزاد رکھا ہے۔ تاہم یہ آزادی صرف امتحان کی مصلحت کی بنا پر ہے۔ ورنہ انسان سے بھی عین وہی روش مطلوب ہے جو بقیہ کائنات میں خدا نے قائم کر رکھی ہے۔ فرق یہ ہے کہ بقیہ کائنات میں یہ روش خدا کے براہِ راست کنٹرول کے تحت قائم ہے اور انسان کی زندگی میں اس کو خود انسان کے اپنے ارادے کے تحت قائم ہونا ہے۔ یہی مفہوم ہے اس حدیث کا جس میں کہا گیا ہے کہ خدا کے اخلاق کو اپنا اخلاق بناؤ: تَخَلَّقُوا بِأَخْلَاقِ اللَّهِ (شرح العقيدة الطحاوية، صفحہ 120)۔

اسلامی اخلاق کی بنیاد اس تصور پر قائم ہے کہ اخلاق ایک کائناتی حقیقت ہے۔ جو اخلاق (standards of conduct) بقیہ کائنات کے لیے مقرر کیا گیا ہے، وہی اخلاق

انسان سے بھی مطلوب ہے۔انسان کے لیے بقیہ کائنات ایک اخلاقی ماڈل کی حیثیت رکھتی ہے۔ایک اچھے انسان کے لیے بھی وہی بات صحیح ہے جو اسپینش رائٹر میگول ڈی سرونیتش(Miguel de Cervantes, 1547-1616) نے ایک اچھے مصوّر کے بارے میں کہی ہے:

Good painters imitate nature,bad ones vomit it.

اچھے مصوّر فطرت کی نقل کرتے ہیں،برے مصوّر اس کو اگل دیتے ہیں۔

انسان کے سوا جو کائنات ہے اس کو خدا نے ایک قانون کا پابند بنا رکھا ہے۔وہ لازمی طور پر اس کے مطابق عمل کرتی ہے۔اس کائناتی قانون کو سائنس کی زبان میں قانون فطرت کہا جاتا ہے۔قرآن میں اسی بات کو اس طرح کہا گیا ہے کہ زمین و آسمان خدا کے امر کے تحت ہیں(32:5)۔

اور پھر یہی مطالبہ انسان سے کیا گیا ہے کہ وہ خدا کے امر کے ماتحت بن کر رہے (آل عمران،3:154)۔حقیقت یہ ہے کہ خدا کا ایک ہی قانون ہے جس کی پیروی کائنات اور انسان دونوں سے مطلوب ہے۔بقیہ کائنات بجبر اس قانون کو اختیار کیے ہوئے ہے۔اور انسان کو خود اپنے ارادہ کے تحت اس قانون کو اختیار کرنا ہے۔

اسلامی اخلاق کا یہ اصول قرآن کی حسب ذیل آیت میں ملتا ہے:

کیا لوگ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں۔حالانکہ اسی کے تابع ہے جو کوئی آسمان اور زمین میں ہے خوشی سے یا ناخوشی سے۔اور سب اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے (3:83)۔

قرآن کی اس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے بقیہ کائنات کا نظام جن اصولوں پر عملاً قائم کر رکھا ہے اسی کے مطابق وہ انسانی زندگی کے نظام کو بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ انسانی معاشرہ کو بھی انہیں ضابطوں میں ڈھل جانا چاہیے جس کا نمونہ کائناتی سطح پر ہر آن دکھایا جارہا ہے۔

اتحاد و تنظیم

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ خدا کی ایک مقررہ سبیل ہے (6:154)۔ تم اسی سبیل خداوندی پر چلو۔ یہی لفظ قرآن میں شہد کی مکھی کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ کہا گیا ہے کہ خدا نے شہد کی مکھی کو حکم دیا کہ تم سبیل رب پر چلو (16:69)۔ اس سے معلوم ہوا کہ شہد کی مکھی جس طرح کام کرتی ہے وہ خدا کی تسلیم شدہ سبیل ہے۔ اسی سبیل کی نقل انسان کو بھی کرنا ہے۔

شہد کی مکھی کا نظام اجتماعی تنظیم کی آئڈیل مثال ہے۔ وہ اپنا پورا عمل اعلیٰ درجہ کی متحدہ کاروائی کے ساتھ انجام دیتی ہے۔ قرآن کے مطابق یہ تنظیم اور متحدہ عمل خدا کا منظور شدہ عمل ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی سماجی زندگی میں اسی کو اپنے تمدّنی احوال کے مطابق اختیار کرے۔ شہد کی تیاری میں لاکھوں مکھیاں شامل رہتی ہیں مگر وہ نہایت درجہ موافق کے ساتھ سارا کام انجام دیتی ہیں۔ انسان کو اپنی زندگی میں بھی موافقت کا یہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔

دخل اندازی نہیں

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ سورج کے لیے سزاوار نہیں کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات کے لیے یہ ہے کہ وہ دن سے پہلے آجائے۔ ہر ایک اپنے مدار (orbit) میں چل رہے ہیں (36:40)۔

اس آیت میں خدا کے ایک قانون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو اس نے سیاروں اور ستاروں کی دنیا میں قائم کر رکھا ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ ستارہ یا سیارہ اپنے اپنے مدار میں حرکت کرے۔ وہ کسی دوسرے سیارہ کے مدار میں داخل نہ ہو۔ یہ گویا خدا کے پسندیدہ سماجی اصول کی ایک مادی تمثیل ہے۔ خدا ستاروں اور سیاروں کے ذریعہ اس قانون کا مظاہرہ کر رہا ہے جس کو وہ انسان کی زندگی میں شعوری طور پر دیکھنا چاہتا ہے۔ یعنی یہ کہ ہر آدمی اپنے اپنے دائرہ میں عمل کرے، وہ کبھی دوسرے شخص کے دائرہ میں داخل نہ ہو۔

قرآن کا یہ اصول ایک مغربی ملک کے قصہ میں بہت خوبصورتی کے ساتھ متمثل ہو رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب اس ملک کو سیاسی آزادی حاصل ہوئی تو ایک شخص خوشی کے ساتھ سڑک پر نکلا۔ وہ اپنا ہاتھ زور زور سے ہلاتا ہوا سڑک پر چل رہا تھا۔ اتنے میں اس کا ہاتھ ایک راہ گیر کی ناک سے ٹکرا گیا۔ راہ گیر نے غصہ ہو کر کہا کہ تم نے میری ناک پر کیوں مارا۔ آدمی نے جواب دیا کہ آج میرا ملک آزاد ہے۔ اب میں آزاد ہوں کہ جو چاہوں کروں۔ راہ گیر نے نہایت متانت سے جواب دیا کہ تمہاری آزادی وہاں ختم ہو جاتی ہے جہاں میری ناک شروع ہوتی ہے:

Your freedom ends where my nose begins.

اس دنیا میں ہر آدمی عمل کے لیے آزاد ہے۔ مگر یہ آزادی لامحدود نہیں ہے۔ ہر آدمی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے محدود دائرہ میں عمل کرے۔ وہ دوسرے کی آزادی میں خلل ڈالے بغیر اپنی آزادی کا استعمال کرے۔ یہ خدائی اخلاقیات کی ایک دفعہ ہے۔ قرآن میں لفظی طور پر اس کا حکم دیا گیا ہے اور آسمان کے ستاروں اور سیاروں کی گردش کو اپنے اپنے مدار کا پابند بنا کر اس اخلاقی اصول کا مظاہرہ (demonstration) کیا جارہا ہے۔

تسلیم واعتراف

قرآن کی ایک آیت اس طرح ہے — پھر تمہارے دل سخت ہو گئے۔ تو وہ پتھر کی مانند سخت ہیں یا اس سے بھی زیادہ سخت۔ اور بعض پتھر ایسے ہیں کہ ان سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں۔ اور بعض پتھر ایسے ہیں کہ وہ پھٹ جاتے ہیں پھر ان میں سے پانی نکل آتا ہے۔ اور بعض پتھر وہ ہیں جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔ اور اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے (2:74)۔

یہ آیت تمثیلی زبان (symbolic language) میں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پتھر کے بعض اوصاف تمثیل کے روپ میں انسان کے لیے اخلاق کا سبق ہیں۔ پہاڑوں میں پتھروں کے درمیان سے چشمے پھوٹتے ہیں اور ان سے دریا بہہ نکلتے ہیں۔ یہ اس انسانی اخلاق کی تمثیل ہے کہ انسان کو سخت دل نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے اندر یہ صلاحیت ہونی چاہیے کہ جب کوئی سچائی اس کے سامنے آئے تو اس کو قبول کرنے کے لیے اس کا سینہ کھل جائے۔ کوئی انسانیت کا موقع آئے تو اس کا سینہ اس کو محسوس کر کے تڑپ اٹھے۔ جس طرح پہاڑ میں پتھروں کے درمیان پانی کا چشمہ ابل پڑتا ہے اسی طرح

انسان کے دل سے حق کے اعتراف کا چشمہ ابل پڑنا چاہیے۔

اسی طرح پتھروں کا پہاڑ سے گرنا (landslide) اس بات کی تمثیل ہے کہ انسان کے سامنے جب خدا کا حکم آئے تو اس کے سامنے اس کو سر تسلیم خم (surrender) کر دینا چاہیے۔اس کو سر کشی کے بجائے اعتراف کا انداز اختیار کرنا چاہیے۔ جس طرح پتھر فطرت کے قانون کے آگے گر پڑتے ہیں اسی طرح انسان کو خدا کے قانون کے آگے ہمہ تن جھک جانا چاہیے۔

نرم گفتاری

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ چڑیاں خدا کی تسبیح پڑھتی ہیں (24:41)۔ دوسری طرف بتایا گیا ہے کہ گدھے کی آواز سب سے بری آواز ہوتی ہے ،اس لیے جب تم بات کرو تو گدھے کی طرح مت چیخو بلکہ آہستہ آواز سے بولو (31:19)۔

اس سے معلوم ہوا کہ خدا کو وہ آواز پسند ہے جس میں چڑیوں کے چہچہے کی سی مٹھاس ہو خدا کو وہ آواز پسند نہیں جس میں آدمی گدھے کی طرح زور زور سے بولنے لگے اور سننے والے کے لیے سمع خراشی کا باعث ہو۔

انسان کے جسم میں زبان انتہائی قیمتی عضو ہے۔اسی زبان کے ذریعہ آدمی اپنے خیال کو دوسرے کے سامنے ظاہر کرتا ہے۔اسی کے ذریعہ دو آدمی باہم تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ تاہم زبان کو استعمال کرنے کی دو مختلف صورتیں ہیں۔ایک یہ کہ آدمی محبت اور خیر خواہی کے جذبے سے بولے۔ وہ جب بولے تو اس لیے بولے کہ وہ دوسروں تک وہ بات پہنچا دینا چاہتا ہے جو اس کے نزدیک بہترین بات ہے۔اس کی زبان ہمیشہ بھلائی کی زبان ہو۔اسی

کے ساتھ اس کا انداز کلام سنجیدہ اور معقول ہو۔ وہ جو بات کہے شرافت اور متانت کے ساتھ کہے۔

اس کے برعکس زبان کے استعمال کی دوسری صورت وہ ہے جس کی ایک مثال گدھے کی صورت میں پائی جاتی ہے یعنی منہ سے ایسی آواز نکالنا جو سننے والوں کو گراں گزرے۔ قرآن کے مطابق آدمی کے اوپر لازم ہے کہ وہ اپنی زبان کو بے معنی شور وغل سے بچائے۔ وہ طنز اور بد گوئی سے پوری طرح بچے۔ وہ اپنی زبان کو ایسے انداز سے استعمال نہ کرے جو سننے والوں کو ناگوار ہو۔ انسان کے بول کو چڑیوں کے چہچہے کی مانند ہونا چاہیے نہ کہ گدھے کی چیخ کی مانند۔

عفو درگزر

حضرت یوسف کے سوتیلے بھائیوں نے حضرت یوسف کے ساتھ جو برا سلوک کیا وہ قدرتی طور پر حضرت یوسف کے والد حضرت یعقوب کے لیے نہایت تکلیف دہ تھا۔ ان کو برادرانِ یوسف سے شدید شکایت پیدا ہوئی۔ مگر اس شکایت کا غبار انہوں نے برادرانِ یوسف پر نہیں نکالا بلکہ فرمایا کہ میں اپنے رنج و غم کی شکایت صرف اللہ سے کرتا ہوں (یوسف، 12:86)۔ حضرت یعقوب کو غصہ انسان کی طرف سے پیدا ہوا تھا مگر اس کو انہوں نے خدا کی طرف موڑ دیا۔

یہ تحویل (diversion) عین وہی چیز ہے جو مادی دنیا میں نہایت کامیابی کے ساتھ قائم ہے۔ بارش کے موسم میں جو پانی برستا ہے وہ اکثر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اگر اس کی ساری مقدار کھیتوں اور آبادیوں میں رہ جائے تو زبردست نقصان ہو۔ ایسے مواقع پر قدرت یہ کرتی

ہے کہ پانی کی ضروری مقدار کو کھیتوں اور آبادیوں میں چھوڑ دیتی ہے اور اس کے بعد پانی کی تمام فاضل مقدار کو نالوں اور ندیوں کی طرف موڑ (divert) کر دیتی ہے۔

قدرت کے اسی اصول کو انسان کی اجتماعی زندگی میں بھی اختیار کرنا ہے۔ وہ یہ کہ جذبات کی تمام مضر مقدار کو خدا کی طرف موڑ دیا جائے۔

مختلف انسان جب مل کر رہتے ہیں تو ان کے درمیان بار بار شکایتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک کے اندر دوسرے کے خلاف تلخیاں ابھرتی ہیں۔ یہ شکایتیں اور تلخیاں جس کے خلاف پیدا ہوئی ہیں اگر وہ اسی کے خلاف نکلنے لگیں تو سارا سماج لڑائی جھگڑے کا میدان بن جائے ان حالات میں انسان کو وہی کرنا ہے جو نیچر کرتی ہے۔ یعنی تمام بڑھے ہوئے جذبات کو خدا کے خانے میں ڈال دینا۔ ایسے تمام معاملات کو خدا کے حوالے کر کے اپنی مثبت تعمیر میں لگ جانا۔ نیچر ایسے عمل سے یہ سبق دیتی ہے کہ ہر آدمی کے پاس ایک تحویلی حوض (diversion pool) ہونا چاہیے جس میں وہ دوسروں کے خلاف پیدا ہونے والے منفی جذبات کو منتقل کر دیا جائے۔ اور اس طرح اپنے آپ کو اعتدال کی حالت میں باقی رکھے۔

برائی کے بدلے بھلائی

قرآن میں خدا کے محبوب بندوں کی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ جب انھیں غصہ آتا ہے تو وہ معاف کر دیتے ہیں (41:37)۔ پیغمبر اسلام نے اپنے پیروؤں کو یہ حکم دیا کہ جو تم سے برا سلوک کرے تم اس سے اچھا سلوک کرو (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2007)۔ بالفاظ دیگر، آدمی کو دوسروں سے برائی ملے تب بھی وہ دوسروں کو بھلائی لوٹائے۔ اس کو اشتعال

دلا یا جائے تب بھی وہ غیر مشتعل رہے۔

یہ اعلیٰ اخلاق عین وہی ہے جس کا تمثیلی نمونہ خدا نے درخت کی صورت میں مادی دنیا کے اندر قائم رکھا ہے، انسان اور درخت دونوں ایک ہی دنیا میں ایک دوسرے کے آس پاس رہتے ہیں۔ انسان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ جب سانس لیتا ہے تو وہ فضا سے آکسیجن لے کر اپنے اندر داخل کرتا ہے اور اپنے اندر سے کاربن نکال کر باہر کی طرف خارج کرتا ہے۔

اگر درخت بھی یہی کرے تو ہماری دنیا مضر گیس سے بھر جائے اور رہائش کے ناقابل ہو جائے۔ مگر درخت انسان کے بالکل برعکس معاملہ کرتا ہے۔ درخت باہر کی کاربن لے لیتا ہے اور اپنے اندر سے آکسیجن نکال کر فضا میں شامل کرتا ہے جو انسان اور حیوانات کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

قرآن جس اخلاق کا مطالبہ انسان سے کرتا ہے اس کا ایک ماڈل اس نے درخت کی دنیا میں عملاً قائم کر رکھا ہے۔ یہ اخلاق جو درخت کی دنیا میں مادی سطح پر قائم ہے، اسی کو انسان اپنی زندگی میں شعوری سطح پر اختیار کرتا ہے۔ جو اخلاقی معیار خدا نے بقیہ دنیا میں براہِ راست اپنے زور پر قائم کر رکھا ہے اسی اخلاقی معیار کو انسانی دنیا میں خود انسان کو اپنے ارادہ سے قائم کرنا ہے۔ تاکہ حضرت مسیح کے الفاظ میں، "خدا کی مرضی جس طرح آسمان پر پوری ہوتی ہے اسی طرح زمین پر بھی پوری ہو" (متی، 6:10)۔

وہ اخلاق یہ ہے کہ دوسرے شخص سے اگر آپ کو نفرت ملے تب بھی آپ اس کو محبت لوٹائیں۔ دوسرے سے آپ کو تکلیف پہنچے تو آپ اس کو اپنی طرف سے آرام پہنچانے کی کوشش کریں۔ لوگ آپ کو غصہ دلائیں تو آپ انھیں معاف کر دیں۔ لوگ منفی رویہ کا

مظاہرہ کریں تب بھی آپ مثبت رویہ سے ان کا جواب دیں۔آپ کا اخلاق یہ نہیں ہونا چاہیے کہ آپ کاربن دینے والے کو کاربن دیں۔بلکہ آپ کا اخلاق یہ ہونا چاہیے کہ جو شخص آپ کو کاربن دے اس کو بھی آپ کی طرف سے آکسیجن ملے۔

خلاصہ

حقیقت یہ ہے کہ عمل کا جو معیار وسیع تر کائنات میں خدا اپنے براہ راست کنڑول کے تحت ظہور میں لا رہا ہے، وہی معیار انسان کو اپنی ذاتی زندگی میں ذاتی کنڑول کے تحت وجود میں لانا ہے۔جو واقعہ خدا نے بقیہ دنیا میں مادی سطح پر قائم کر رکھا ہے۔اسی واقعہ کو انسانی دنیامیں انسان کی سطح پر قائم کرنا ہے۔

کائناتی سطح پر جو چیز لوہا کی شکل میں پائی جاتی ہے وہ انسانی سطح پر پختہ کرداری کی صورت میں مطلوب ہے۔کائناتی سطح پر جو چیز پتھریلی زمین سے چشمہ کی صورت میں بہہ نکلتی ہے وہ انسان سے نرم مزاجی کی صورت میں مطلوب ہے۔کائناتی سطح پر جو چیز قابل پیشین گوئی کردار کی صورت میں پائی جاتی ہے وہ انسانی سطح پر ایفائے عہد(وعدہ پورا کرنا) کی صورت میں مطلوب ہے۔کائناتی سطح پر جو چیز مہک اور رنگ کی صورت میں پائی جاتی ہے وہ انسانی سطح پر اچھے سلوک اور خوش معاملگی کی صورت میں مطلوب ہے۔

درخت خراب ہوا(کاربن) کو لے لیتا ہے اور اسکے بدلے اچھی ہوا(آکسیجن) ہماری طرف لوٹا دیتا ہے۔یہی بات انسانی سطح پر اس اصول کی صورت میں مطلوب ہے کہ "جو تمہارے ساتھ برا سلوک کرے اس کے ساتھ تم اچھا سلوک کرو" کائنات میں کوئی چیز کسی دوسرے کی کاٹ میں لگی ہوئی نہیں ہے۔ہر ایک پوری یکسوئی کے ساتھ اپنا حصہ ادا

کرنے میں مصروف ہے۔یہی چیز انسانی سطح پر اس طرح مطلوب ہے کہ وہ ہمیشہ مثبت جدوجہد کرے، منفی نوعیت کی کاروائیوں سے وہ مکمل طور پر پرہیز کرے۔کائنات میں recycleاور decompose کرنے کا اصول کارفرما ہے۔فضلات دوبارہ استعمال ہونے کے لیے گیس میں تبدیل کر دیے جاتے ہیں۔پتی درخت سے گر کر ضائع نہیں ہوتی بلکہ کھاد بن جاتی ہے۔یہی چیز انسانی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ انسان کی خرچ کی ہوئی دولت دوبارہ انسان کے لیے مفید بنے۔ایک انسان کی چھیڑی ہوئی جدوجہد دوسرے انسانوں کو اچھے پھل کا تحفہ دے۔

کائنات میں عظیم الشان سطح پر بے شمار کام ہو رہے ہیں۔ہر جزء انتہائی صحت اور پابندی کے ساتھ اپنی ڈیوٹی کی انجام دہی میں لگا ہوا ہے۔مگر کسی کو یہاں کوئی ظاہری بدلہ نہیں ملتا۔یہی چیز انسان سے اس طرح مطلوب ہے کہ وہ مکمل طور پر اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں لگا رہے۔بغیر اس کے کہ دنیا میں اس کو اس کے عمل کا کوئی معاوضہ ملنے والا ہو۔اونچا پہاڑ اور تمام کھڑی ہوئی چیزیں اپنا سایہ زمین پر ڈال دیتی ہیں۔یہی چیز انسانی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ ہر آدمی تواضع کا طریقہ اختیار کرے۔کوئی شخص کسی کے اوپر فخر نہ کرے۔کوئی شخص دوسرے کے مقابلہ میں اپنے کو بڑا نہ سمجھے۔

اسلامی اخلاق حقیقتاً کائناتی اخلاق کا دوسرا نام ہے،کائنات کی سطح پر یہ اخلاقی معیار شعور کے بغیر قائم ہے۔اور انسان کی سطح پر یہ اخلاقی معیار شعور کے تحت خود اپنے ارادے سے قائم ہوتا ہے۔

فکری انقلاب

المعہد العلمی للفکر الاسلامی کا بین اقوامی سیمینار (کوالالمپور، جولائی 1984) مسلم نوجوانوں میں ایک نئے فکری دور کی علامت ہے۔ معہد کے فکر کا خلاصہ اس کے تعارفی پمفلٹ میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ موجودہ زمانے میں امت مسلمہ کی ناکامی کا سبب خود اس کے اندر ہے، نہ کہ اس کے باہر۔ وہ سبب ہے — ضروری بنیاد تیار کیے بغیر عملی اقدامات کرنا۔ معہد کے نزدیک پہلی ضروری چیز وہ ہے جس کو اسلامیۃ المعرفۃ (Islamization of Knowledge) کے لفظوں میں بیان کیا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ امت کے موجودہ بحران کو حل کرنے کے سلسلے میں پہلا قدم یہ ہے کہ علم کو اسلامی بنایا جائے:

> The first step toward a genuine solution of present crisis of the Ummah is the Islamization of knowledge.

تقریباً 12 سال پہلے میں نے ایک مقالہ لکھا تھا۔ یہ مقالہ عربی زبان میں اگست 1973 میں شائع ہوا۔ اس کا عنوان:

لا بُدَّ مِنَ الثَّوْرَةِ الفِكْرِيَّةِ قَبْلَ الثَّوْرَةِ التَّشْرِيعِيَّةِ

اس مقالہ میں تفصیل سے یہ دکھایا گیا تھا کہ سیاسی یا قانونی انقلاب سے پہلے فکری انقلاب ضروری ہے۔ امت کے عملی مسائل صرف اس وقت حل ہوں گے جب کہ ہم فکری انقلاب کے ذریعہ اس کے موافق فضا بنا چکے ہوں۔

یہاں میں یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ عین وہی بات ہے جو خود قرآن کی رو سے ہمارا اہم ترین اجتماعی فریضہ قرار پاتی ہے۔ قرآن میں دو مقام پر (2:193; 8:39) یہ حکم دیا گیا ہے۔ سورہ البقرہ میں یہ الفاظ ہیں: وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ (2:193)۔ اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے۔

جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن عمر کی تشریح سے معلوم ہوتا ہے، اس آیت میں فتنہ سے مراد شرک جارح ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ اس وقت اسلام تھوڑا تھا۔ چنانچہ جب کوئی شخص دین توحید کو اختیار کرتا تو اہل شرک اسے ستاتے۔ کسی کو وہ قتل کر دیتے، کسی کو زنجیروں میں باندھتے اور کسی کو عذاب دیتے۔ یہاں تک کہ اسلام کی کثرت ہو گئی اور یہ صورت حال باقی نہ رہی کہ عقیدہ توحید کی بنا پر کسی کو ستایا جائے (صحیح البخاری، حدیث نمبر 4650)۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہاں فتنہ سے وہی چیز مراد ہے جس کو ایذا رسانی (persecution) کہا جاتا ہے۔ یعنی مختلف عقیدہ رکھنے کی بنا پر کسی کو ستانا۔ قدیم زمانہ میں شرک کو غلبہ حاصل تھا۔ چنانچہ اہل شرک ہزاروں سال تک یہ کرتے رہے کہ وہ توحید کا عقیدہ رکھنے والوں کو ستاتے: وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ (85:8)۔ اور ان سے ان کی دشمنی اس کے سوا کسی وجہ سے نہ تھی کہ وہ ایمان لائے اللہ پر جو زبردست ہے، تعریف والا ہے۔

پیغمبر آخر الزماں کا مشن جس کو آپ نے اپنی زندگی میں مکمل فرمایا، وہ یہ تھا کہ آپ مذہبی جبر کے ماحول کو ختم کر دیں۔ وہ شرک کے عمومی غلبہ کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیں۔ تا کہ خدا کے بندوں کے لیے توحید کا عقیدہ اختیار کرنے میں جو چیز رکاوٹ بن رہی ہے وہ

رکاوٹ باقی نہ رہے۔اسی لیے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بارے میں فرمایا:

وَأَنَا أَحْمَدُ، وَأَنَا الْمَاحِي الَّذِي يَمْحُو اللَّهُ بِيَ الْكُفْرَ (صحیح البخاری حدیث نمبر 4880)۔میں احمد، میں مٹانے والا ہوں، میرے ذریعہ سے اللہ کفر کو مٹائے گا۔

موجودہ زمانہ میں شرک کی جارحانہ حیثیت ختم ہو چکی ہے۔ مگر غور کیجئے تو اصل صورت حال دوبارہ ایک نئی شکل میں لوٹ آئی ہے۔آج دوبارہ انسان کے لیے دین توحید اختیار کرنے کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہو گئی ہیں۔ مگر آج دین سے روکنے والا عنصر اپنا کام فکری طاقت کے زور پر کر رہا ہے،نہ کہ شمشیری طاقت کے زور پر۔

آج کا فتنہ جدید ملحدانہ افکار کا فتنہ ہے۔جو کام قدیم زمانہ میں شرک کرتا تھا وہ آج ملحدانہ افکار انجام دے رہے ہیں۔آج کی دنیا میں ایسے افکار غالب آ گئے ہیں جو خدا کے وجود کو مشتبہ قرار دیتے ہیں۔جو وحی والہام کو فرضی بتاتے ہیں،جو آخرت کو بے بنیاد ثابت کر رہے ہیں۔اس طرح یہ افکار دین توحید کو اختیار کرنے میں مانع بنے ہوئے ہیں۔آج کا فتنہ یہ ہے کہ خود سوچنے کے انداز کو بنیادی طور پر بدل دیا گیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کا انسان یا تو منکر بن گیا ہے یا وہ کم از کم متشکک (agnostic) ہے۔

یہ ایک قسم کا فکری حملہ (intellectual invasion) ہے۔ہم کو اس حملہ کا مقابلہ کرنا ہے۔اب ہمیں دوبارہ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ (8:39) پر عمل کرنا ہے۔یعنی ان سے مقابلہ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ مگر یہ عمل شمشیر کے ذریعہ نہیں ہو گا، بلکہ افکار کی طاقت کے ذریعہ ہو گا۔ملحدانہ افکار کا جواب ہمیں توحیدی افکار سے

دینا ہے۔آج ضرورت ہے کہ اعلیٰ علمی استدلال سے جدید ملحدانہ افکار کو بے بنیاد ثابت کر دیا جائے۔ہماری یہ جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک یہ نظریات اپنا غلبہ کھو نہ دیں اور توحید کا فکر وقت کا غالب فکر نہ بن جائے۔

غلبہ اور مغلوبیت کا یہ واقعہ اوّلاً فکری میدان میں ہو گا۔یہ اسی قسم کا ایک واقعہ ہو گا جیسا کہ ہم موجودہ زمانہ میں مغربی افکار کی مثال میں دیکھ رہے ہیں۔موجودہ زمانہ میں سائنسی علوم نے روایتی علوم پر غلبہ پایا ہے۔شہنشاہی نظریہ کے اوپر جمہوری نظریہ فایق ثابت ہوا ہے۔ تخلیقی طرزِ فکر پر ارتقائی طرز فکر کو بالاتری حاصل ہے۔اجتماعی معیشت کے نظریہ کے مقابلہ میں انفرادی معیشت کا نظریہ دفاعی پوزیشن میں چلا گیا ہے۔یہ سب کے سب فکری غلبہ کے واقعات ہیں۔اسی نوعیت کا غلبہ ملحدانہ فکر پر مواحدانہ فکر کے لیے مطلوب ہے۔یہی غلبہ ملت کی اگلی تمام کامیابیوں کی تمہید ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور اہم بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔وہ یہ کہ موجودہ زمانے میں ملحدانہ افکار کا غلبہ ان کی کسی جوہری اہمیت کی وجہ سے نہیں ہوا ہے۔یہ تمام تر صرف مغالطہ کے ذریعہ حاصل کیا گیا ہے۔موجودہ زمانے میں جو نئے سائنسی حقائق دریافت ہوئے وہ حقیقتاً قدرت خداوندی کے بھیدوں کا اظہار تھے۔اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ دین توحید کے حق میں فطرت کے دلائل تھے مگر مسلمان مختلف اسباب سے جدید سائنسی علوم میں پیچھے ہو گئے۔وہ اس قابل نہ ہو سکے کہ ان علوم کو صحیح رخ دے سکیں۔اوران کو دین کی تائید میں استعمال کریں۔ملحد علماء نے اس خلا سے فائدہ اٹھایا۔انھوں نے جدید معلومات کو غلط تعبیر کے ذریعہ اپنے حق میں استعمال کیا۔جن واقعات سے دین

توحید کا اثبات نکل رہا تھا، ان کو دین الحاد کی دلیل بنا دیا۔

اس کی ایک واضح مثال ارتقاء کا نظریہ ہے، جس نے موجودہ زمانے میں ملحدانہ فکر پیدا کرنے میں سب سے زیادہ اہم رول ادا کیا ہے۔ زمینی طبقات کے مطالعہ کے دوران انسان کے علم میں یہ بات آئی کہ قدیم زمانہ کے حیوانات کے ڈھانچے مخصوص کیمیائی عمل کے نتیجہ میں پتھر کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ زمین کی کھدائی سے اس قسم کے بہت سے متحجر نمونے (fossils) جمع کیے گئے۔ ان پر ریڈیو ایکٹیوڈیٹنگ کا طریقہ استعمال کیا گیا تو تقریباً صحت کے ساتھ ان کی تاریخیں معلوم ہو گئیں۔ یہ تحقیقات سو سال سے بھی زیادہ لمبے عرصے تک جاری ہیں۔ یہاں تک کہ انسان اس پوزیشن میں ہو گیا کہ مختلف انواع حیات کے درمیان تاریخ کے اعتبار سے ترتیب قائم کر سکے۔

اس تاریخی ترتیب سے معلوم ہوا کہ وہ تمام مختلف انواع حیات جو آج زمین پر بظاہر بیک وقت نظر آ رہی ہیں وہ سب زمین پر بیک وقت موجود نہیں ہو گئیں، بلکہ زمین پر ان کے ظہور میں ایک تاریخی ترتیب ہے، وہ یہ کہ سادہ انواع حیات سب سے پہلے ظہور میں آئیں۔ اس کے بعد بتدریج زیادہ پے چیدہ انواع حیات ظہور میں آتی رہیں۔ یہاں تک کہ بالآخر انسان ظاہر ہو گیا۔ اس طرح واحد الخلیہ جاندار (single cellular animal) زمین پر وجود میں آئے۔ اور انسان اس حیاتیاتی ترتیب کے سب سے آخر میں ظاہر ہوا۔

نظریہ ارتقاء کی عمارت جن مشاہدات پر قائم کی گئی ہے۔ ان سب سے اہم مشاہدہ یہی ہے۔ نظریہ ارتقاء کے حامیوں کا کہنا ہے کہ یہ ترتیب بتاتی ہے کہ زندگی کی مختلف قسمیں ارتقائی عمل کے ذریعہ ظہور میں آئیں، یعنی زندگی کا ہر اگلا فارم اپنے پچھلے فارم سے

نکلتا رہا۔ یہ ترقی ہر اگلی نسل میں جمع ہوتی رہی یہاں تک کہ اس کے آخری مجموعہ نے وہ اعلیٰ صورت اختیار کرلی جس کو انسان کہا جاتا ہے۔

مگر یہ سراسر غلط تعبیر کا نتیجہ ہے، نہ کہ کسی حقیقی استدلال کا نتیجہ۔ خالص علمی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو جو بات مشاہدہ میں آئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ زمین پر انواع حیات کی موجودگی میں ایک زمانی ترتیب پائی جاتی ہے، نہ کہ انواع حیات ایک دوسرے کے بطن سے بطریق تناسل پیدا ہوتی چلی گئی ہیں۔

اصل مشاہدہ صرف تخلیق کی زمانی ترتیب کو بتا رہا تھا مگر غلط تعبیر کے ذریعہ اس کو زندگی کے ارتقائی ظہور کے ہم معنی بنا دیا گیا۔ ارتقاء کے مشاہدات خالق (Creator) کی تردید نہیں کرتے، جیسا کہ خود چارلس ڈارون نے اپنی کتاب "اصل الانواع" میں تسلیم کیا ہے۔ بلکہ اگر یہ مشاہدات درست ہوں، تو وہ خالق کے تخلیقی عمل کی ترتیب کو بتاتے ہیں۔

یہ مختصر جائزہ یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ موجودہ زمانے میں اسلام کے احیاء کی راہ کا پہلا بنیادی کام اسلام کا فکری غلبہ ہے۔ مزید یہ کہ یہ فکری غلبہ بظاہر دشوار ہونے کے باوجود انتہائی آسان ہے۔ اسلام کی پچھلی تاریخ میں اس سے ملتی جلتی مثالیں اس کے ثبوت کے لیے کافی ہیں۔

رسول کے زمانے میں عرب کے لوگ اسلام کے نہایت سخت دشمن کے روپ میں ظاہر ہوئے مگر صرف ربع صدی کی دعوتی جدوجہد نے بتایا کہ اس طاقت ور دشمن کے اندر طاقتور مددگار کی شخصیت چھپی ہوئی تھی۔ اس طرح ساتویں صدی ہجری میں تارتاری قبائل اسلام کے خلاف ناقابل تسخیر قوت بن کر ابھرے۔ مگر ایک صدی سے بھی کم

عرصہ میں معلوم ہوا کہ یہ طاقت ور تلوار صرف اس لیے ظاہر ہوئی تھی کہ بالآخر وہ اسلام کے طاقت ور خادم اور محافظ بن جائے۔

یہی موجودہ زمانہ کے "اسلام دشمن" علوم کا معاملہ ہے۔

ان علوم نے بظاہر آج اسلام کو مغلوب کر رکھا ہے۔ لیکن اگر ہم اپنی کوششوں کو صحیح رخ سے جاری کر سکیں تو نصف صدی بھی نہیں گزرے گی کہ یہ سارا علم اسلام قبول کر لے گا، وہ اسلام کے علم کلام کی صورت اختیار کر لے گا اور پھر دنیا دیکھے گی کہ جدید علمی قوت صرف اس لیے ظاہر ہوئی تھی کہ وہ خدا کے دین کی طاقت ور مددگار بن جائے۔

اسلام کے حق میں اس نتیجہ کو حاصل کرنے کی صرف ایک ہی ضروری شرط ہے۔ وہ یہ کہ ہم دوسرے میدانوں میں اپنی جو قوت ضائع کر رہے ہیں اس کو سمیٹ کر اسی ایک میدان، فکری انقلاب لانے کے میدان میں لگا دیں۔ جس دن یہ واقعہ ہو گا اسی دن اسلام کی نئی تاریخ بننا شروع ہو جائے گی۔ اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ صحیح آغاز ہی دراصل صحیح اختتام کا دوسرا نام ہے۔[4]

---

[4] یہ مقالہ (انگریزی زبان میں) کوالالمپور کے انٹرنیشنل سیمینار جولائی 1984ء میں پیش کیا گیا۔

دورِ جدید میں قرآنی دعوت

مسلمانوں کے اوپر اللہ تعالیٰ نے مختلف فریضے عائد کیے ہیں۔اپنے آپ کو خدا کا عبادت گزار بنانے سے لے کر مسلمانوں کی اصلاح تک بہت سی ذمہ داریاں ہیں جن میں مسلمان بندھے ہوئے ہیں۔انھیں میں سے ایک ذمہ داری وہ ہے جس کو اسلامی دعوت یا دعوت الی اللہ کہا جاتا ہے۔اس کا مقصد غیر مسلم اقوام تک خدا کے سچے دین کا پیغام پہنچانا ہے۔یہ مسلمانوں کی قومی جدوجہد کا عنوان نہیں بلکہ پیغمبر کی وراثت ہے جو ختمِ نبوّت کے بعد مسلمانوں کے حصہ میں آئی ہے۔

امت مسلمہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے دنیا و آخرت کی تمام بھلائیاں دعوت الی اللہ کے کام سے وابستہ کر دی ہیں،ایک طرف قرآن کے مطابق دعوت الی اللہ میں عصمت من الناس کا راز چھپا ہوا ہے (5:67)۔دوسری طرف یہی وہ کام ہے جس کی ادائیگی کے نتیجے میں اہل ایمان آخرت میں خدا کی گواہی کے بلند مقام پر کھڑے کیے جائیں گے جس کو قرآن میں اصحابِ اعراف (7:46) کہا گیا ہے۔یہ آخرت کا سب سے بڑا اعزاز ہے جو داعیان حق کو دیا جائے گا۔

تاہم دعوت الی اللہ کا کام کوئی سادہ یا آسان کام نہیں۔یہ رسول اور اصحاب رسول کی تاریخ کو از سر نو دہرانا ہے۔یہ خدا کے بندوں کے سامنے خدا کا نمائندہ بننا ہے۔یہ دنیا میں خدا کی حمد اور کبریائی کا نغمہ چھیڑنا ہے۔یہ غیبی حقیقت کو لوگوں کے لیے مشہود حقیقت بنانا ہے،جو کچھ اس سے پہلے پیغمبرانہ سطح پر ہوتا رہا ہے اس کو غیر پیغمبرانہ سطح پر انجام دینا ہے۔

دعوت کی اصل نوعیت آدمی کے سامنے نہ ہو تو وہ دعوت کے نام پر ایک ایسا کام کرے گا جس کا دعوت سے کوئی تعلق نہیں۔

عالمی فضا کی تبدیلی

اس سلسلے میں پہلی بات جس کو جاننا ضروری ہے۔وہ یہ کہ وہ کون سے حالات ہیں جن کے درمیان ہم کو دعوت حق کا کام انجام دینا ہے۔ مختصر لفظوں میں اس کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے اسلاف کے لیے دعوت الی اللہ کا مطلب دور شرک کو ختم کرنا تھا۔اب ہمارے لیے دعوت الی اللہ کا مطلب دور الحاد کو ختم کرنا ہے۔ ہمارے اسلاف دور شرک کو ختم کرکے دور توحید لے آئے۔اس کے بعد دنیا میں ایک نئی تاریخ وجود میں آئی۔ یہ تاریخ ہزار سال تک کامیابی کے ساتھ چلتی رہی۔ یہاں تک کہ سولھویں صدی عیسوی میں مغربی سائنس کا ظہور ہوا۔اس کے بعد دنیا کی ایک نئی تاریخ بننا شروع ہوئی۔ بیسویں صدی میں آکر یہ تاریخ اپنے کمال پر پہنچ گئی ہے۔اب دوبارہ یہ حال ہو گیا ہے کہ ظہور اسلام سے پہلے جس طرح فکر و عمل کے تمام شعبوں پر شرک کا غلبہ تھا، اسی طرح اب فکر و عمل کے تمام شعبوں پر الحاد کا غلبہ ہو چکا ہے۔ حتیٰ کہ آج مذہب بھی علمی طور پر الحاد کا ضمیمہ بن چکا ہے۔اس سے الگ اس کی کوئی مستقل حیثیت نہیں۔

یہاں ایک لطیفہ قابل ذکر ہے موجودہ زمانے میں مذہب کی صورت کو بہت اچھی طرح واضح کرتا ہے۔ جرمن مفکر ای، ایف، شوماخر (1911-1977) نے اپنا ایک واقعہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

On a visit to Leningrad some years ago (August

1968), I consulted a map to find out where I was, but I could not make it out. I could see several enormous churches, yet there was no trace of them on my map. When finally an interpreter came to help me, he said: "we don't show churches on our maps". (E. F. Schumacher, *A Guide for the Perplexed*, London, 1981, p.9)

اگست 1968ء میں روس کے شہر لینن گراڈ گیا۔ وہاں ایک دن میں ایک نقشہ دیکھ رہا تھا تاکہ میں جانوں کہ میں کہاں ہوں۔ مگر میں اس کو جان نہ سکا۔ میری نظروں کے سامنے کئی بڑے بڑے چرچ تھے۔ مگر میرے نقشہ میں ان کا کوئی نشان موجود نہیں تھا۔ بالآخر ایک ترجمان نے میری مدد کی۔ اس نے کہا" ہم اپنے نقشوں میں چرچ کو نہیں دکھاتے"۔

یہ جزئی واقعہ اس پوری صورت حال کی تصویر ہے جو موجودہ زمانے میں پیش آئی ہے۔ جدید انسان نے خدا کو اپنے علمی اور فکری نقشوں سے نکال دیا ہے۔ موجودہ زمانے میں جغرافیہ، تاریخ، طبیعیات، نباتات، حیوانات، فلکیات وغیرہ تمام علوم نہایت تفصیل کے ساتھ مرتب کیے گئے ہیں۔ مگر ان علوم میں کہیں بھی خدا کا ذکر نہیں۔ ایک شخص جس کو نظر حاصل ہو، جب وہ آنکھ اٹھا کر کائنات کو دیکھتا ہے تو ہر طرف اس کو خدا کا نشان نمایاں نظر آتا ہے، مگر مدوّن علوم میں خدا ہر جگہ ایک غیر موجود چیز ہے۔ ان علوم کو پڑھنے والا کہیں بھی خدا کا کوئی حوالہ نہیں پاتا۔

ان حالات میں دعوت توحید کا کام گویا خدا کو از سر نو فکر انسانی کے نقشہ پر لکھنا ہے۔ عالمی سطح پر ایک ایسا فکری انقلاب لانا ہے کہ انسان دوبارہ خدائی اصطلاحوں میں سوچنے کے

قابل ہو سکے۔اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ توحید اور آخرت کی بات آدمی کی سمجھ میں آئے اور اس کو وہ حقیقت سمجھ کر قبول کر سکے۔ ہمارے اسلاف نے انسانی فکر کی دنیا میں شاکلۂ شرک کو توڑ کر شاکلۂ توحید کو قائم کیا تھا۔اب ہم کو دوبارہ شاکلۂ الحاد کو توڑ کر شاکلۂ توحید پر انسانی فکر کا نظام قائم کرنا ہے۔ دعوت کے مسئلہ کا اس سے کم تصور دعوت کے مسئلہ کی تصغیر (underestimation) ہے، جس کی کوئی قیمت نہ بندوں کے نزدیک ہے اور نہ خدا کے نزدیک۔

داعی اور مدعو کا تعلق

دوسرا اہم مسئلہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ بحال کرنا ہے۔امت مسلمہ کی حیثیت سے مسلمان خدا کے دین کے داعی ہیں اور بقیہ تمام قومیں ان کے لیے مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے سب سے بڑی غلطی یہ کی ہے کہ انھوں نے دوسری قوموں کو اپنا قومی حریف اور مادی رقیب بنا لیا ہے۔ان قوموں سے وہ ساری دنیا میں معاشی اور سیاسی جھگڑے چھیڑے ہوئے ہیں۔ قرآن میں داعی کا کلمہ لَا أَسۡئَلُكُمۡ عَلَيۡهِ أَجۡرًا (11:51) بتایا گیا ہے،یعنی میں اس پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ایسی حالت میں حقوق طلبی کے یہ تمام ہنگامے اپنی دعوتی حیثیت کی نفی کے ہم معنی ہیں۔

اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے یہاں ہم کو خدا کے گواہ کا مقام حاصل ہو تو ہم کو یہ قربانی دینی ہوگی کہ دوسری اقوام سے ہمارے دنیوی جھگڑے، خواہ وہ بظاہر درست کیوں نہ ہوں،ان کو ہم یک طرفہ طور پر ختم کر دیں۔تاکہ ہمارے اور دوسری قوموں کے درمیان

داعی اور مدعو کا رشتہ قائم ہو، ہمارے اور دوسری قوموں کے درمیان وہ معتدل فضا وجود میں آئے جس میں ان کے سامنے توحید اور آخرت کی دعوت پیش کی جائے اور وہ سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کر سکیں۔

صلح حدیبیہ (6ھ) میں مسلمانوں نے یک طرفہ طور پر مخالفین اسلام کے تمام معاشی اور قومی مطالبات مان لیے تھے۔ انھوں نے اپنے حقوق سے دستبرداری پر خود اپنے ہاتھ سے دستخط کر دیے تھے۔ مگر جب مسلمان یہ معاہدہ کر کے لوٹے تو خدا کی طرف سے یہ آیت اتری — اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا (48:1)۔ بیشک ہم نے تم کو کھلی ہوئی فتح دے دی۔

بظاہر شکست کے معاہدے کو خدا نے فتح کا معاہدہ کیوں کہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس معاہدہ نے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان مقابلے کے میدان کو بدل دیا تھا۔ اب اسلام اور غیر اسلام کا مقابلہ ایک ایسے میدان میں منتقل ہو گیا تھا جہاں اسلام واضح طور پر زیادہ بہتر حیثیت (advantageous position) میں تھا۔

غیر مسلموں کی جارحیت کی وجہ سے اس وقت اسلام اور غیر اسلام کا مقابلہ جنگ کے میدان میں ہو رہا تھا۔ غیر مسلموں کے پاس ہر قسم کے زیادہ بہتر جنگی وسائل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہجرت کے بعد مسلسل غزوات کے باوجود معاملہ کا فیصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ اب حدیبیہ میں غیر مسلموں کے تمام قومی مطالبات مان کر ان سے یہ عہد لے لیا گیا کہ دونوں فریقوں کے درمیان دس سال تک براہ راست یا بالواسطہ کوئی جنگ نہیں ہو گی۔

مسلسل جنگی حالات کی وجہ سے اسلام کا دعوتی کام رکا ہوا تھا۔ جنگ بند ہوتے ہی دعوت

کا کام پوری قوت کیساتھ ہونے لگا۔ جنگی میدان میں اس وقت اسلام کمزور تھا۔ مگر جب مقابلہ پرامن تبلیغ کے میدان میں آگیا تو یہاں شرک کے پاس کچھ نہ تھا جس سے وہ توحید کی حقانیت کا مقابلہ کر سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عرب کے قبائل اتنی کثرت سے اسلام میں داخل ہوئے کہ کفر کا زور بالکل ٹوٹ گیا اور معاہدہ کے صرف دو سال کے اندر مکہ فتح ہو گیا۔

موجودہ زمانہ میں بھی اسی طرح کے ایک "معاہدہ حدیبیہ" کی ضرورت ہے۔ مسلمان دوسری قوموں سے ہر جگہ مادی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ مسلمان چوں کہ اپنی غفلت کی وجہ سے مادی پہلو سے دوسری قوموں کے مقابلے میں بہت پیچھے ہو گئے ہیں، وہ ہر محاذ پر ان سے شکست کھا رہے ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ یک طرفہ قربانی کے ذریعے ان محاذوں کو بند کر کے میدان مقابلے کو بدل دیا جائے۔ ان قوموں کو مادی مقابلے کے میدان سے ہٹا کر فکری مقابلے کے میدان میں لایا جائے۔ قدیم زمانے میں میدان مقابلہ کی یہ تبدیلی جنگ کو یک طرفہ طور پر ختم کر کے حاصل کی گئی تھی، آج یہ تبدیلی قومی حقوق کی مہم کو یک طرفہ طور پر ختم کر کے حاصل ہو گی۔

قومی مفادات کی یہ قربانی بلاشبہ ایک نہایت مشکل کام ہے مگر اسی کھونے میں پانے کا سارا راز چھپا ہوا ہے۔ مسلمان جس دن ایسا کریں گے اسی دن فتح اسلام کا آغاز ہو جائے گا۔ کیوں کہ فکری میدان میں کسی اور کے پاس کوئی چیز موجود ہی نہیں۔ مادی مقابلے کے میدان میں مسلمانوں کے پاس "روایتی ہتھیار" ہیں اور دوسری قوموں کے پاس "جدید ہتھیار"۔ جب کہ فکری میدان میں مسلمانوں کے پاس حقیقت ہے اور دوسری قوموں کے پاس تعصب، اور حقیقت کے مقابلہ میں تعصب دیر تک ٹھہر نہیں سکتا۔

لٹریچر کی تیاری

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ خدا نے قلم کے ذریعہ انسان کو تعلیم دی: عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (96:4)۔اس سے اسلامی دعوت کے لیے لٹریچر کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

مگر اسلامی لٹریچر کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام کے نام پر کچھ کتابیں لکھی جائیں اور ان کو کسی نہ کسی طرح مختلف زبانوں میں چھاپ کر تقسیم کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی لٹریچر کا معاملہ کوئی سادہ معاملہ نہیں۔ یہ بشری سطح پر قرآن کا بدل فراہم کرنا ہے۔

خدا نے اپنا کلام عربی زبان میں اتارا ہے۔ مگر اس کی تبلیغ دوسری زبان والوں تک بھی کرنی ہے،اور جیسا کہ قرآن سے ثابت ہے، مدعو کو ان کی اپنی زبان میں تبلیغ کرنی ہے(14:4)۔اس لحاظ سے اگر عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (96:4) کو وقتی نہ سمجھا جائے بلکہ اس کو ابدی پس منظر (perspective) میں رکھ کر دیکھا جائے تو یقینی طور پر انسان بھی اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ دوسری زبانوں میں تعلیم بالقلم کا فریضہ انسان ہی کو ادا کرنا ہے۔ گویا یہ کہنا صحیح ہو گا کہ خدا عربی زبان میں معلّم بالقلم بنا تھا،اب ہم کو دوسری زبانوں میں معلم بالقلم بننا ہے۔ مشہور عرب شاعر لبید نے قرآن کو سن کر شاعری چھوڑ دی۔ کسی نے کہا کہ تم اب شاعری کیوں نہیں کرتے۔انھوں نے کہا کہ قرآن کے بعد بھی: أبعد القرآن (الاستیعاب لابن عبد البر، جلد 3، صفحہ 1337)۔اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن نے اپنے زمانہ کے افراد کو ذہنی طور پر مفتوح کر لیا تھا۔اسی طرح آج دوبارہ ایسا اسلامی لٹریچر درکار ہے جو لوگوں کو ذہنی طور پر مفتوح کر لے۔

بظاہر یہ بات ناممکن دکھائی دیتی ہے۔ مگر اس ناممکن کو خود خدا نے ہمارے لیے ممکن

بنادیا ہے۔ خدانے حق کے داعیوں کی مدد کے لیے انسانی تاریخ میں ایک نیا انقلاب برپا کیا۔ یہاں میری مراد سائنسی انقلاب سے ہے۔ سائنسی انقلاب کے ذریعہ نئے استدلالی امکانات انسان کی دسترس میں آگئے۔ حتیٰ کہ بلا تشبیہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ آج ہمارے لیے یہ ممکن ہوگیا ہے کہ مخاطب کے سامنے دین کے حق میں وہ اعجازی استدلال پیش کرسکیں جو پہلے صرف خدا کے پیغمبروں کی دسترس میں ہوتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ کائنات ایک عظیم الشان خدائی معجزہ ہے۔ وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اپنے خالق کی ذات وصفات کے حق میں معجزاتی دلیل ہے۔ تاہم قدیم زمانے میں یہ خدائی معجزہ ابھی تک غیر دریافت شدہ حالت میں پڑا ہوا تھا۔ اس لیے خدانے قدیم زمانے میں پیغمبروں کو مخصوص طور پر خارق عادت معجزے دیے۔

مگر پیغمبر اسلام کے مخاطبین کے مسلسل مطالبہ کے باوجود انھیں مذکورہ قسم کا کوئی معجزہ نہیں دکھایا گیا۔ بلکہ قرآن میں کائنات کا حوالہ دیا گیا۔ کہا گیا کہ کائنات میں خدا کی آیات موجود ہیں ان کو دیکھو۔ وہی تمھارے یقین کے لیے کافی ہیں۔ چوں کہ قرآن دور سائنس کے آغاز میں آیا اس لیے قرآن میں کائنات کی نشانیوں کا حوالہ دینا کافی سمجھا گیا۔ ابدی پس منظر میں، قرآن کا مخاطب وہ انسان تھا جو دور سائنس میں جی رہا ہو۔ اور دور سائنس کے انسان کو خدا اور اس کی باتوں پر یقین کرنے کے لیے کسی خارق عادت معجزہ کی ضرورت نہیں۔

معجزہ سے کیا مطلوب ہے۔ معجزہ سے مطلوب محض کوئی حیران کن کرشمہ دکھانا نہیں بلکہ دعوت حق کو مخاطب کے لیے آخری طور پر ثابت شدہ بنانا ہے۔ دعوت کی

موافقت میں ایسے دلائل جمع کرنا ہے جس کے بعد مخاطب کے لیے انکار کی گنجائش باقی نہ رہے۔ قدیم زمانے میں اسی مقصد کے لیے خارق عادت معجزہ دکھایا جاتا تھا۔ موجودہ زمانے میں یہی کام رموز فطرت کو منکشف کر کے سائنس نے انجام دے دیا ہے۔ واضح ہو کہ قرآن میں پیغمبرانہ معجزوں اور کائناتی نشانیوں کے لیے ایک ہی مشترک لفظ استعمال ہوا ہے اور وہ آیت (نشانی) ہے۔

خدا کے دین کی دعوت اتمام حجت کی حد تک مطلوب ہے (النساء، 4:165)۔ اسی اتمام حجت کے لیے قدیم زمانے میں پیغمبروں کے ذریعہ معجزے دکھائے گئے۔ اب سوال یہ ہے کہ آج کی قوموں کے لیے بھی یہی مطلوب ہے کہ دین کی دعوت ان کے سامنے اتمام حجت کی حد تک پیش کی جائے۔ پھر موجودہ زمانے میں اس کا ذریعہ کیا ہے جب کہ پیغمبروں کی آمد اب ختم ہو چکی ہے۔

جدید سائنسی انقلاب اسی سوال کا جواب ہے۔ جدید سائنسی انقلاب کے ذریعہ یہ ممکن ہو گیا ہے کہ دین حق کی تعلیمات کو عین اس معیار پر ثابت کیا جا سکے جو انسان کا اپنا تسلیم شدہ معیار ہے۔ اس سلسلے میں پہلی اہم ترین بات وہ ہے جو طریق استدلال (methodology) سے تعلق رکھتی ہے۔ جدید سائنس نے مختلف میدانوں میں اپنی تحقیقات کے نتیجے میں اس بات کا قطعی اقرار کیا ہے کہ استنباطی استدلال (inferential argument) اپنی نوعیت کے اعتبار سے اتنا ہی معقول (valid) ہے جتنا کہ براہ راست استدلال۔ یہی قرآن کا طرز استدلال ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں علم انسانی نے قرآن کے طرزِ استدلال کو عین وہی درجہ دے دیا ہے جو علوم دینیہ سے باہر خود انسان کا تسلیم شدہ طرز

استدلال ہے۔

جدید سائنس کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ جو چیز پہلے صرف خارجی اطلاع کی حیثیت رکھتی تھی وہ اب خود انسانی دریافت بن چکی ہے۔ جدید سائنس نے معلوم کیا ہے کہ انسان اپنی محدودیت (limitations) کی وجہ سے کلی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس سے واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسانی رہنمائی کے لیے وحی کی ضرورت ہے۔ جدید سائنس نے معلوم کیا ہے کہ کائنات میں تحکمی نظام (arbitrary system) ہے اس سے واضح طور پر خدا کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ جدید سائنس نے معلوم کیا ہے کہ موجودہ دنیا کے ساتھ ایک اور غیر مرئی متوازی دنیا موجود ہے جس کا سائنسی نام اینٹی ورلڈ (antiworld) ہے۔ اس سے واضح طور پر عالم آخرت کا وجود ثابت ہوتا ہے، وغیرہ۔

اسی طرح مقناطیسی میدان (magnetic field) اور حرکت (motion) کی یکجائی سے بجلی کی روشنی کا پیدا ہونا ویسا ہی ایک حیرت ناک خدائی معجزہ ہے جیسا ہاتھ کو بغل میں رکھ کر نکالنے سے ہاتھ کا غیر معمولی طور پر چمک اٹھنا، بڑے بڑے جہازوں کا اتھاہ سمندروں اور ناقابل عبور فضاؤں میں انسان کو لے کر دوڑنا ویسا ہی دہشت خیز خدائی معجزہ ہے جیسا دریا کا پھٹ کر انسانوں کو پار ہونے کا راستہ دینا۔ مادہ سے متحرک مشینوں کا وجود میں آنا ویسا ہی عجیب خدائی معجزہ ہے جیسا کہ لاٹھی کا سانپ بن کر چلنے لگنا۔

واقعہ یہ ہے کہ قدیم زمانے میں پیغمبروں کو جو معجزے دیے گئے وہ سب باعتبار مواد استدلال خدا کی پیدا کی ہوئی کائنات میں وسیع پیمانے پر موجود ہیں۔ مگر قدیم زمانے میں چوں کہ وہ انسان کے علم میں نہیں آئے تھے اس لیے خدا نے لوگوں کو خارق عادت

معجزے دکھائے۔ آج سائنسی تحقیقات نے فطرت کی یہ نشانیاں کھول دی ہیں اس لیے آج کے انسان کے یقین وایمان کے لیے وہی کافی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سائنسی انقلاب خدا کے معجزہ کا ظہور ہے۔اس کے ذریعہ خدا کی تمام باتیں اعجازی سطح پر ثابت ہو رہی ہیں۔اگران سے گہری واقفیت حاصل کی جائے اور ان کو دعوت حق کی حمایت میں استعمال کیا جائے تو یہ دعوت کے ساتھ معجزہ کو جمع کرنے کے ہم معنی ہو گا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر آج ہم حقیقی معنوں میں سائنسی دلائل کے ساتھ دین کی دعوت پیش کر سکیں تو زمین پر دوبارہ یہ واقعہ ظہور میں آئے گا کہ وقت کا "لبید" یہ کہہ دے کہ — کیا حقیقت کے اس طرح ثابت ہو جانے کے بعد بھی۔

سائنسی استدلال موجودہ زمانے میں معجزاتی استدلال کا بدل ہے۔جدید سائنس نے تمام دینی تعلیمات کو علمی طور پر ثابت شدہ یا کم از کم قابل فہم (understandable) بنا دیا ہے۔تاہم اسلام کے داعیوں نے ابھی تک اس کو واقعی معنوں میں استعمال نہیں کیا۔راقم الحروف نے اس موضوع پر دس سالہ مطالعہ کے بعد 1964ء میں ایک کتاب، "مذہب اور جدید چیلنج" لکھی تھی جو عربی زبان میں "الاسلام یتحدی" اور انگریزی زبان میں گاڈ ارائزز (God Arises) کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔تاہم پچھلے 20 سال میں علم کا دریا بہت آگے جا چکا ہے۔چنانچہ اب میں اس موضوع پر، ان شاءاللہ، دوسری جامع کتاب تیار کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔وبیداللہ التوفیق۔

دعوت دین کا کام انتہائی مشکل کام ہے۔ مگر اللہ نے اپنی خصوصی رحمت سے اس کو ہمارے لیے آسان بنا دیا ہے۔اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسانی تاریخ میں ایسی تبدیلیاں کیں جس نے ہمارے لیے نئے مواقع کھول دیے۔ موجودہ زمانے میں یہ تاریخی عمل اپنی آخری حد تک پہنچ گیا ہے۔ حتیٰ کہ اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ جو کام پہلے "خون" کے ذریعے کرنا پڑتا تھا، اس کو اب قلم کی سیاہی کے ذریعے انجام دیا جا سکے۔

اس عمل تیسیر کے تین خاص پہلو ہیں جن کی طرف قرآن میں اشارے کیے گئے ہیں:

1۔قرآن میں اہل ایمان کو یہ دعا تلقین کی گئی: رَبَّنَا وَلَا تَحۡمِلۡ عَلَيۡنَآ اِصۡرًا كَمَا حَمَلۡتَهٗ عَلَى الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِنَا (2:286)۔خدایا، ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے پچھلی امتوں پر ڈالا تھا۔

اگر الفاظ بدل کر اس آیت کی تفسیر کی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دعوت توحید کا جو کام پچھلے داعیوں کو پابندی رائے کے ماحول میں کرنا پڑتا تھا، لیکن ہمیں آزادی رائے کے ماحول میں کرنے کا موقع عطا فرما۔پہلے زمانہ میں یہ صورت حال تھی کہ توحید کا اعلان کرنے والے کو پتھر مارے جاتے۔اس کو آگ میں ڈال دیا جاتا۔اس کے جسم کو آرے سے چیر دیا جاتا،اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلے زمانہ میں حکومت کی بنیاد شرک پر قائم تھی۔ پچھلے زمانہ کے بادشاہ مفروضہ دیوتاؤں کے نمائندہ بن کر حکومت کرتے تھے۔اس لیے جب کوئی شخص شرک کو بے بنیاد قرار دیتا تو اس زمانہ کے بادشاہوں کو محسوس ہوتا کہ وہ نظریاتی بنیاد ختم ہو رہی ہے جس پر انھوں نے اپنی حکومت کو قائم کر رکھا ہے۔

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے جو انقلاب آیا اس نے شرک کی اجتماعی حیثیت کو ختم کرکے اس کو ایک ذاتی عقیدہ بنا دیا۔ اب شرک الگ ہو گیا اور سیاسی ادارہ الگ۔ اس طرح وہ دور ختم ہو گیا جب کہ شرک لوگوں کے لیے اعلان توحید کی راہ میں رکاوٹ بن سکے۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن میں ان الفاظ میں آئی ہے — وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (8:39)۔ اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سب اللہ کے لیے ہو جائے۔

اس سلسلے میں دوسری بات یہ ہے کہ اسلام نے جب توہم پرستی اور شخصی تقدس کا خاتمہ کیا تو نسلی بادشاہت کی بنیادیں بھی ہل گئیں۔ چنانچہ انسانی تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوا جو بالآخر یورپ پہنچ کر جمہوریت (democracy) کی صورت میں مکمل ہوا۔ اس کے بعد شخصی حاکمیت کے بجائے عوامی حاکمیت کا اصول دنیا میں رائج ہوا اور آزادی رائے کو ہر آدمی کا مقدس حق تسلیم کر لیا گیا۔ اس عالمی فکری انقلاب نے داعیان حق کے لیے یہ عظیم امکان کھول دیا کہ وہ غیر ضروری رکاوٹوں سے بے خوف ہو کر ساری دنیا میں حق کے اعلان کا کام انجام دے سکیں۔

2۔ قرآن میں یہ اعلان کیا گیا: سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (41:53)۔ ہم عنقریب آفاق میں اور انفس میں ایسی نشانیاں دکھائیں گے جس سے کھل جائے کہ یہ سراسر حق ہے۔ قرآن کی اس آیت میں اس انقلاب کی طرف اشارہ ہے جس کو جدید سائنسی انقلاب کہا جاتا ہے۔

کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ خدا کی دلیل ہے۔ تمام مخلوقات اپنے خالق کی

صفات کا اظہار کر رہی ہیں۔ گویا کائنات قرآن کی دلیل ہے۔تاہم یہ دلیل سائنسی انقلاب سے پہلے بڑی حد تک غیر دریافت شدہ حالت میں پڑی ہوئی تھی۔اس دریافت کے لیے ضروری تھا کہ چیزوں کی گہرائی کے ساتھ تحقیق کی جائے۔ مگر شرک کا عقیدہ اس تحقیق کی راہ میں حائل تھا۔ مشرک انسان کائنات کے مظاہر کو پرستش کی چیز سمجھے ہوئے تھا پھر وہ اس کو تحقیق کی چیز کیسے بناتا۔

توحید کے عمومی انقلاب نے اس رکاوٹ کو ختم کر دیا۔اسلامی انقلاب کے بعد کائنات کے تقدس کا ذہن ختم ہو گیا۔اب کائنات کے مظاہر پر آزادنہ غور و فکر شروع ہو گیا۔ یہ کام صدیوں تک عالمی سطح پر جاری رہا۔ یہاں تک کہ بالآخر وہ یورپ پہنچا۔یورپ میں اس کو موزوں زمین ملی۔ یہاں اس نے تیزی سے ترقی کی۔ یہاں وہ عظیم فکری انقلاب ظہور میں آیا جس کو موجودہ زمانے میں سائنسی انقلاب کہا جاتا ہے۔

سائنسی تحقیق کے ذریعے کائنات کے جو حقائق معلوم ہوئے ہیں وہ قرآن کی دعوت کو قطعیات کی سطح پر ثابت کر رہے ہیں۔اس کی تفصیل راقم الحروف نے اپنی کتاب، مذہب اور جدید چیلنج (الاسلام یتحدی) میں کی ہے۔ جو لوگ زیادہ تفصیل کے خواہش مند ہوں وہ اس کتاب میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

3۔اس سلسلے میں تیسری چیز وہ ہے جس کی طرف قرآن کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے: عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا(17:79)۔قریب ہے کہ اللہ تم کو ایک مقام محمود پر کھڑا کرے۔

محمود کے معنی ہیں "تعریف کیا ہوا"۔ تعریف دراصل تسلیم و اعتراف کی آخری

صورت ہے، کسی کو ماننے والا جب اس کو ماننے کی آخری حد پر پہنچتا ہے تو وہ اس کی تعریف کرنے لگتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالٰی کی اسکیم یہ تھی کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلیم شدہ نبوت کے مقام پر کھڑا کرے۔ پیغمبر اسلام دنیا میں بھی محمود تھے اور آخرت میں بھی محمود، شفاعت کبریٰ جس کا ذکر حدیث میں ہے وہ آخرت میں آپ کا مقام محمود ہے اور آپ کا تاریخی طور پر مسلم اور معترف ہونا دنیا میں آپ کا مقام محمود۔

خدا کی طرف سے ہر دور میں اور ہر قوم میں پیغمبر آئے۔ یہ سب پیغمبر تھے۔ ان سب کا پیغام بھی ایک تھا۔ مگر مختلف اسباب سے ان پیغمبروں کو تاریخی حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔ تاریخی ریکارڈ کے مطابق آج کے انسان کے لیے ان پیغمبروں کی حیثیت نزاعی نبوت کی ہے، نہ کہ مسلمہ نبوت کی۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تاریخی طور پر ایک ثابت شدہ نبوت ہے۔ جب کہ دوسرے نبیوں کی نبوت تاریخی طور پر ثابت شدہ نہیں، اس بنا پر آج یہ ممکن ہو گیا ہے کہ ہم تسلیم شدہ (established) نبوت کی سطح پر دین کی دعوت دے سکیں۔ جب کہ اس سے پہلے ہمیشہ متنازعہ (controversial) نبوت کی سطح پر دین کی دعوت دینی پڑتی تھی۔

ڈاکٹر نشی کانت چٹو پادھیائے (اسلامی نام محمد عزیزالدین) ہندوستان کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو تھے۔ وہ انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر چٹو پادھیائے کو حق کی تلاش ہوئی۔ اس غرض سے انھوں نے ہندی، انگریزی، جرمن، فرانسیسی وغیرہ زبانیں سیکھیں۔ انھوں نے تمام مذاہب کا مطالعہ کیا۔ مگر وہ کسی پر مطمئن نہ ہو سکے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے پایا کہ یہ تمام مذاہب

تاریخی معیار پر ثابت نہیں ہوتے۔ پھر کس طرح ان کی واقعیت پر یقین کیا جائے اور ان کو مستند سمجھا جائے۔

آخر میں انھوں نے اسلام کا مطالعہ کیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اسلام کی تعلیمات آج بھی اپنی اصل صورت میں پوری طرح محفوظ ہیں۔ اسلام کی شخصیات مکمل طور پر تاریخی شخصیات ہیں نہ کہ دیومالائی شخصیات۔ وہ لکھتے ہیں کہ "میں نے پایا کہ پیغمبر اسلام کی زندگی میں کوئی چیز مبہم اور دھندلی نہیں۔ اور نہ پر اسرار یا دیومالائی ہے، جیسا کہ مثال کے طور پر، زرتشت اور شری کرشن کے یہاں، حتٰی کہ بدھا اور مسیح کے یہاں ہے۔ دیگر پیغمبروں کے وجود تک کے بارے میں اہل علم نے شبہ کیا ہے۔ حتٰی کہ انکار کیا ہے مگر جہاں تک میں جانتا ہوں، پیغمبر اسلام کے بارے میں کوئی یہ جرأت نہ کر سکا کہ ان کو توہماتی عقیدہ یا پریوں کی کہانی کہہ سکے"۔

اس کے بعد ڈاکٹر نشی کانت چٹوپادھیائے کہتے ہیں:

Oh, what a relief to find,after all a truly historical Prophet to believe in. (*Why have I Accepted Islam*, Dr Nishikanta Chattopadhyay)

اُف، کیسا عجیب تسکین کا سامان ہے کہ بالآخر آدمی واقعی معنوں میں ایک تاریخی پیغمبر کو پالے جس پر وہ ایمان لا سکے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں مقام محمود (17:79) کہا گیا ہے۔ نبوتِ تاریخی ہی کا دوسرا نام نبوتِ محمودی ہے۔ پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو مقام محمود پر کھڑا کرنے کا یہ مطلب ہے کہ آپ دوسرے پیغمبروں کی طرح، تاریخی طور پر کوئی نامعلوم شخصیت یا غیر ثابت شدہ شخصیت نہیں ہوں گے، بلکہ آپ تمام انسانوں کے لیے پوری طرح ایک معلوم اور مسلّم شخصیت ہوں گے۔ آپ کی سیرت بھی

ایک محفوظ سیرت ہو گی اور آپ کی تعلیم بھی ایک محفوظ تعلیم۔

یہ داعیان اسلام کے لیے موجودہ زمانے میں بہت بڑا advantage ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دعوت کے میدان میں وہ بلا مقابلہ کامیابی حاصل کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔

انسان پیدائشی طور پر اپنی فطرت میں خدا کی طلب لے کر پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کو سچائی کی تلاش ہوتی ہے۔ وہ انسانی علوم میں اپنی طلب کا جواب دریافت کرنا چاہتا ہے مگر وہ دریافت نہیں کر پاتا۔ پھر وہ مذاہب کا مطالعہ کرتا ہے تو پاتا ہے کہ موجودہ تمام مذاہب تاریخی پہلو سے غیر محفوظ ہیں۔ ان کو تاریخی اعتباریت (historical credibility) کا درجہ حاصل نہیں۔ یہاں ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ انسان سے کہہ سکیں کہ تم جس چیز کی تلاش میں ہو وہ محفوظ اور مستند حالت میں ہمارے یہاں موجود ہے۔ دوسروں کے پاس صرف غیر تاریخی پیغمبر ہیں جن کو وہ دنیا کے سامنے پیش کریں۔ مگر اسلام کا پیغمبر مکمل طور پر ایک تاریخی پیغمبر ہے۔ تاریخ کے مسلمہ معیار کے مطابق آپ کے بارے میں کسی قسم کا شک کرنے کی گنجائش نہیں۔ دوسروں کے پاس متنازعہ نبوت ہے اور اسلام کے پاس مسلمہ نبوت۔

یہ اللہ تعالیٰ کی انتہائی عظیم نعمت ہے۔ اس نے ممکن بنا دیا ہے کہ خدا کے دین کی دعوت آج مسلّمہ نبوت کی سطح پر دی جائے، جب کہ اس سے پہلے وہ صرف متنازعہ نبوت کی سطح پر دی جاسکتی تھی۔

مخالفانہ عمل کو ختم کرنا

موجودہ زمانے میں اسلامی دعوت کا کام دراصل جدید اقوام پر اتمام حجت کے ہم معنی

ہے۔ یہ ایک عظیم الشان کام ہے۔ جس کے لیے عظیم الشان وسائل اور غیر معمولی موافق حالات درکار ہیں۔ یہ وسائل اور حالات مسلم ملکوں میں یقینی طور پر مل سکتے ہیں۔ مگر وہ اسی وقت مل سکتے ہیں جب کہ مسلم حکومتوں کو اسلامی دعوت کا حریف نہ بنایا جائے۔

1891ء کا واقعہ ہے کہ جاپان کے شہنشاہ میجی (1912-1868) کا ایک خط ترکی کے سلطان عبد الحمید ثانی (1918-1842) کو ملا۔ اس خط میں سلطان سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ مسلم مبلغین کو جاپان بھیجے تاکہ وہ وہاں کے لوگوں کو اسلام سے واقف کرائیں۔ سلطان عبد الحمید نے اس اہم کام کے لیے سید جمال الدین افغانی (-1838 1997) کا انتخاب کیا اور ان کو ہر طرح کے سرکاری تعاون کو یقین دلایا۔

مگر یہی سید جمال الدین افغانی جن کو سلطان عبد الحمید نے اس قدر احترام اور تعاون کا مستحق سمجھا تھا، بعد کو اسی سلطان نے سید جمال الدین افغانی کو جیل میں بند کر دیا۔ حتیٰ کہ جیل خانے ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سلطان کو معلوم ہوا کہ سید جمال الدین افغانی اس کے خلاف سیاسی سازش میں مشغول ہیں۔ جمال الدین افغانی سلطان کو مغربی استعمار کا ایجنٹ سمجھتے تھے اور اس کو تخت سے بے دخل کر دینا چاہتے تھے۔ جو شخص جاپان میں اسلام کی تاریخ کا آغاز کرنے والا بن سکتا تھا وہ صرف جیل کے رجسٹر میں اپنے نام کا اضافہ کر کے رہ گیا۔

یہی تمام مسلم حکمرانوں کا حال ہے۔ اگر آپ اسلامی دعوت کے کام میں مشغول ہوں تو وہ ہر طرح کا اعلیٰ ترین تعاون آپ کو دیں گے۔ لیکن اگر آپ ان کے خلاف سیاسی مہم چلائیں تو وہ آپ کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

بدقسمتی سے موجودہ زمانے میں مسلسل سید جمال الدین افغانی کے اسوہ کو دہرایا

جارہاہے۔ مسلمان کہیں ایک عنوان سے اور کہیں دوسرے عنوان سے، اپنے حکمرانوں کے خلاف سیاسی لڑائی میں مشغول ہیں۔ حتیٰ کہ آج "اسلامی دعوت" کا لفظ مسلم حکمرانوں کے لیے سیاسی اپوزیشن کے ہم معنی بن کر رہ گیا ہے۔

اس کی وجہ سے نہ صرف یہ نقصان ہوا ہے کہ اسلامی دعوت کی مہم میں مسلم حکومتوں کا بھرپور تعاون حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ بلکہ اگر کوئی شخص حکومت سے بے نیاز ہو کر ذاتی طور پر اس ذمہ داری کو ادا کرنا چاہے تو حکومت اس کو شبہ کی نظر سے دیکھنے لگتی ہے اور اس کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتی ہے۔

ضرورت ہے کہ مسلم حکمرانوں سے سیاسی منازعت کو مکمل طور پر ختم کر دیا جائے، خواہ وہ اسلام کے نام پر ہو یا کسی اور نام پر۔ تاکہ ہر مسلم ملک میں اسلامی کارکنوں کو ان کی قومی حکومتوں کا تعاون حاصل ہو اور اسلام کے احیاء کا کام بڑے پیمانے پر شروع کیا جاسکے، غیر مسلموں میں اسلام کا پیغام پہنچانے کے لیے بھی اور خود مسلمانوں کی اپنی تعمیر واصلاح کے لیے بھی۔

افراد کار کی فراہمی

دعوت اسلامی کی ذمہ داری کو ادا کرنے اور موجودہ مواقع کو استعمال کرنے کے لیے افراد کار کی ضرورت ہے۔ قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ مسلمانوں میں سے کچھ منتخب لوگ مخصوص تربیت کے ذریعے اس مقصد کے لیے تیار کیے جائیں۔ وہ دین میں تفقہ حاصل کر کے مختلف قوموں میں جائیں اور ان کو توحید کی تعلیم دیں اور آخرت سے آگاہ کریں: فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ (9:122)۔ آج دنیا میں مسلمانوں کے بے شمار مدرسے اور تعلیم کے

ادارے ہیں مگر ساری دنیا میں کوئی ایک مدرسہ بھی خاص اس مقصد کے لیے موجود نہیں جہاں خالص دعوتی ضرورت کے تحت لوگوں کی تعلیم وتربیت کی جائے تاکہ وہ وقت کی ضرورت کے مطابق تیار ہوکر موثر انداز میں لوگوں کے اوپر دعوت الی اللہ اور انذار آخرت کا کام کریں۔ آج کی ناگزیر ضرورت ہے کہ ایسی ایک تعلیم گاہ قائم کی جائے اور اس کو معیار کے مطابق بنانے کے لیے ہر وہ قیمت ادا کی جائے جو موجودہ حالات میں ضروری ہے۔

افراد کار کے سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کو صرف "باعلم" نہیں بلکہ "بامقصد" ہونا چاہیے۔ مقصد کے بغیر علم صرف معلومات ہے۔ مگر علم جب مقصد کے ساتھ ہو تو وہ معرفت بن جاتا ہے۔ اگر ایک ایسی تعلیم گاہ قائم ہو جہاں ڈگری یافتہ اساتذہ کے ذریعے لوگوں کو قدیم وجدید علوم پڑھا دیے جائیں تو صرف اس بنا پر وہ مطلوبہ داعی نہیں بن جائیں گے۔ ضروری ہے کہ ان کے سینے میں مقصد کی آگ لگی ہوئی ہو۔ کیوں کہ مقصد ہی لوگوں کے اندر وہ اعلیٰ فکر اور اعلیٰ کردار پیدا کرتا ہے جس کے ذریعے وہ دعوت کے میدان میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کر سکیں۔

خواہ کوئی دنیوی مقصد ہو یا دینی مقصد، دونوں ہی کے لیے ایسے افراد درکار ہیں جو ایک اعلیٰ مقصد کی خاطر ہر قسم کی ضروری قربانی دے سکیں۔

ٹائمس (*The Times*) لندن کا ایک قدیم اخبار ہے۔ اس اخبار میں 1900 میں ایک اشتہار چھپا۔ اس اشتہار کے ساتھ نہ عورتوں کی تصویریں تھیں نہ کسی قسم کے بناوٹی تماشے۔ اس میں ایک چھوٹے سے چوکھٹے میں حسب ذیل الفاظ درج تھے — ایک جوکھم کے سفر کے لیے آدمی درکار ہیں۔ معمولی رقم، سخت سردی، مکمل تاریکی کے لمبے

مہینے، مسلسل خطرہ، محفوظ واپسی مشتبہ۔ کامیابی کی صورت میں عزّت اور اعتراف:

Men wanted for Hazardous Journey. Small wages, bitter cold, long months of complete darkness, constant danger safe return doubtful. Honour and recognition in case of success.

Sir Ernest Shackleton, 4 Burlington St.

یہ اشتہار قطب جنوبی کی مہم کے لیے تھا۔اس کے جواب میں اتنی زیادہ درخواستیں آئیں کہ ذمہ داروں کو ان میں سے انتخاب کرنا پڑا۔اسی قسم کے بلند ہمت لوگ تھے جو مغرب میں سائنسی انقلاب لائے اور اہل مغرب کے لیے عالمی قیادت کی راہ ہموار کی۔

مذکورہ بالامثال ایک دنیوی مثال تھی۔یہی معاملہ ان لوگوں کا بھی ہے جنھوں نے اسلام کی تاریخ بنائی۔بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر انصار مدینہ کے نمائندہ افراد سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو اس کی نمایاں مثال پیش کرتی ہے۔یہاں ہم سیرت ابن ہشام کا ایک حصہ نقل کرتے ہیں:

قَالَ كَعْبٌ: ثُمَّ خَرَجْنَا إِلَى الْحَجِّ، وَوَاعَدْنَا رَسُولَ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم بِالْعَقَبَةِ مِنْ أَوْسَطِ أَيَّامِ التَّشْرِيقِ. قَالَ: فَلَمَّا فَرَغْنَا مِنْ الْحَجِّ، وَكَانَتْ اللَّيْلَةُ الَّتِي وَاعَدْنَا رَسُولَ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم لَهَا، وَمَعَنَا عَبْدُ الله بن عمرو بن حرام أبو جابر، سيد من سادتنا، وَشَرِيفٌ مِنْ أَشْرَافِنَا، أَخَذْنَاهُ مَعَنَا وَكُنَّا نَكْتُمُ مَنْ مَعَنَا مِنْ قَوْمِنَا مِنْ الْمُشْرِكِينَ أَمْرَنَا... قَالَ: فَنِمْنَا تِلْكَ اللَّيْلَةَ مَعَ قومنا فِي رِحَالِنَا، حَتَّى إذَا مَضَى ثُلُثُ اللَّيْلِ خَرَجْنَا مِنْ رِحَالِنَا

لِمِيعَادِ رَسُولِ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم نَتَسَلَّلُ تَسَلُّلَ القَطا مُستَخفين، حَتَّى اجْتَمَعْنَا فِي الشِّعْب عِنْدَ الْعَقَبَةِ، وَنَحْنُ ثَلَاثَةٌ وَسَبْعُونَ رَجُلًا، وَمَعَنَا امْرَأَتَانِ مِنْ نِسَائِنَا (سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 441)۔ یعنی، کعب بن مالک انصاری کہتے ہیں کہ ہم مدینہ سے حج کے لیے روانہ ہوئے، اور (پچھلے سال) ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لیے تشریق کے درمیانی دن کا وعدہ کیا تھا۔ چنانچہ جب ہم حج سے فارغ ہوگئے اور وہ رات آگئی جس میں ہمیں حسبِ وعدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنا تھا۔ ہمارے ساتھ ہمارے ایک معزز سردار ابو جابر عبد اللہ بن عمرو بن حرام تھے۔ ہم نے ان سے گفتگو کی، وہ ہمارے ساتھی بن گئے۔ چنانچہ ہم نے ان کو اپنے ساتھ لے لیا۔ اس کے علاوہ دوسرے مشرکین کو ہم اپنا منصوبہ نہیں بتاتے تھے۔ رات کے وقت ہم دوسروں کی طرح ان کے ساتھ سوگئے۔ یہاں تک کہ جب رات کا تہائی حصہ گزر گیا تو ہم رسول اللہ کی قرار داد کے مطابق اپنے بستروں سے خاموشی کے ساتھ اٹھے، اور طے شدہ مقام کی طرف اس طرح چلے جیسے چڑیا جھاڑیوں میں آہستہ آہستہ سکڑ کر چلتی ہے۔ یہاں تک کہ ہم سب، تہتر مرد اور دو عورتیں، عقبہ کی گھاٹی میں اکٹھا ہوگئے۔

اس کے بعد کیا واقعہ پیش آیا، اس کو ابن اسحاق نے آگے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

قَالَ ابْنُ إسْحَاقَ: وَحَدَّثَنِي عَاصِمُ بْنُ عُمَرَ بْنِ قَتَادَةَ: أَنَّ الْقَوْمَ لَمَّا اجْتَمَعُوا لِبَيْعَةِ رَسُولِ اللَّهِ صلى الله عليه وسلم قَالَ الْعَبَّاسُ

بْنُ عُبَادَةَ بْنِ نَضْلَةَ الْأَنْصَارِيُّ، أَخُو بَنِي سَالِمِ بْنِ عَوْفٍ: يَا مَعْشَرَ الْخَزْرَجِ، هَلْ تَدْرُونَ عَلَامَ تُبَايِعُونَ هَذَا الرَّجُلَ؟ قَالُوا: نَعَمْ، قَالَ: إنَّكُمْ تُبَايِعُونَهُ عَلَى حَرْبِ الْأَحْمَرِ وَالْأَسْوَدِ مِنْ النَّاسِ، فَإِنْ كُنْتُمْ تَرَوْنَ أَنَّكُمْ إذَا نُهِكَتْ أَمْوَالُكُمْ مُصِيبَةً، وَأَشْرَافُكُمْ قَتْلًا أَسْلَمْتُمُوهُ، فَمِنْ الْآنَ، فَهُوَ وَاَللَّهِ إنْ فَعَلْتُمْ خِزْيُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، وَإِنْ كُنْتُمْ تَرَوْنَ أَنَّكُمْ وَافُونَ لَهُ بِمَا دَعَوْتُمُوهُ إلَيْهِ عَلَى نَهْكَةِ الْأَمْوَالِ، وَقَتْلِ الْأَشْرَافِ، فَخُذُوهُ، فَهُوَ وَاَللَّهِ خَيْرُ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، قَالُوا: فَإِنَّا نَأْخُذُهُ عَلَى مُصِيبَةِ الْأَمْوَالِ، وَقَتْلِ الْأَشْرَافِ، فَمَا لَنَا بِذَلِكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ إنْ نَحْنُ وَفَّيْنَا بِذَلِكَ؟ قَالَ: الْجَنَّةُ. قَالُوا: اُبْسُطْ يَدَكَ، فَبَسَطَ يَدَهُ فَبَايَعُوهُ(سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 446)۔یعنی، یثرب کے لوگ جب آپ سے بیعت کے لیے جمع ہوئے تو عباس بن عبادہ بن نضلہ انصاری نے کہا: اے گروہ خزرج ! کیا تم جانتے ہو کہ تم کس چیز پر ان کے ہاتھ بیعت کر رہے ہو۔ انہوں نے کہا ہاں۔ عباس بن عبادہ نے کہا، تم سرخ و سفید سے جنگ پر بیعت کر رہے ہو۔ اگر تمہارا یہ خیال ہو کہ جب تمہارا مال ضائع ہو اور تمہارے اشراف قتل کیے جائیں تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ان کی قوم کے حوالے کر دو گے تو ابھی ایسا کر لو۔ کیونکہ بعد کو تم نے ایسا کیا تو خدا کی قسم وہ دنیا وآخرت کی رسوائی ہوگی، او را گر تمہارا یہ خیال ہو کہ تم نے جو کچھ وعدہ کیا ہے اس کو تم پورا کرو گے، خواہ تمہارے مال ضائع ہوں اور تمہارے اشراف قتل کیے جائیں تو ان کو اپنے ساتھ لے جاؤ، کیونکہ خدا کی

قسم یہ دنیاوآخرت کی بھلائی ہے۔ان لوگوں نے کہا: مال کے ضائع ہونے اور اپنے اشراف کے قتل کے (اندیشہ کے باوجود) ہم آپ سے بیعت کررہے ہیں۔اس وقت اہل انصار نے آپ سے سوال کیا کہ اگر ہم آپ سے کیے اپنے وعدہ کو پورا کریں تو ہمارے لیے کیا ہے۔ آپ نے کہا: جنت۔ انھوں نے کہا: اپنا ہاتھ بڑھائیے، پھر ان لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

اسی قسم کے باشعور اور باہمت اصحاب تھے جنھوں نے تاریخ میں شرک کے تسلسل کو ختم کیا اور انسانی تاریخ کے رخ کو بدل دیا۔آج دوبارہ تاریخ کو وہی حرکت دینے کی ضرورت ہے جو ہمارے اسلاف نے اپنے زمانے میں دیا تھا۔انھوں نے شرک کے دور کو ختم کر کے توحید کا دور شروع کیا۔اب ہم الحاد کے دور کو ختم کر کے دوبارہ توحید کا دور انسانی تاریخ میں لانا ہے۔یہ ایک بہت اعلیٰ کام ہے۔اور اس کے لیے اعلیٰ افراد انتہائی طور پر ضروری ہیں۔ضرورت ہے کہ ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جہاں تعلیم وتربیت کے ذریعہ ایسے افراد تیار کیے جائیں۔ڈاکٹر فلپ ہٹی کے الفاظ میں،آج اسلام کو دوبارہ ایک ہیروؤں کی نرسری (nursery of heroes) درکار ہے۔اس کے بغیر یہ اہم کام انجام نہیں پاسکتا۔مذکورہ درس گاہ گویا اسی قسم کی ایک نرسری ہو گی جہاں دعوت اسلامی کے ہیرو تیار کیے جائیں۔

دعوتی مرکز کا قیام

اوپر میں نے ڈاکٹر نشی کانت چٹوپادھیا(اسلامی نام محمد عزیزالدین) کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے اپنے 1904ء کے لیکچر میں قدیم حیدرآباد میں کہا تھا:

I feel sure, that if a comprehensive Islamic mission were started in Hyderabad (India) to preach the simple and sublime truths of Islam to the people of Europe. America and Japan, there would be such rapid and enormous accession to its ranks as has not been witnessed again ever since the first centuries of the Hejira, will you, therefore, organise a grand central Islamic Mission here in Hyderabad and open branches in Europe. America and in Japan? (*Why have I Accepted Islam*, Dr Nishikanta Chattopadhyay)

مجھ کو یقین ہے کہ اگر حیدرآباد میں ایک مکمل اسلامی مشن شروع کیا جائے جس کا مقصد اسلام کی صاف اور سادہ سچائیوں کی تبلیغ ہو اور اس کو یورپ ،امریکہ اور جاپان کے لوگوں تک پہنچایا جائے تو اسلام اتنی تیز اور عظیم سطح سے نفوذ کرے گا جس کی مثال پہلی صدی ہجری کے بعد دوبارہ نہیں دیکھی گئی۔کیا آپ لوگ اسلامی مشن کا ایک عظیم مرکز حیدر آباد (ہندوستان) میں بنائیں گے جس کی شاخیں یورپ امریکہ اور جاپان میں ہوں (واضح ہو کہ حیدرآباد کا لفظ یہاں محض اتفاقی ہے،اس سے مراد کوئی بھی مناسب شہر ہے، نہ کہ صرف حیدرآباد)۔

ایک سعید مسلم روح نے 80 سال پہلے یہ بات کہی تھی۔ مگر بد قسمتی سے ابھی تک یہ واقعہ نہ بن سکی۔آج سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ ایک ایسا عظیم دعوتی مرکز قائم کیا جائے جو تمام جدید وسائل سے لیس ہو۔جہاں ہر قسم کے ضروری دعوتی اور

تربیتی شعبے قائم ہوں۔اور اسی کے ساتھ وہ ہر قسم کی سیاست اور ہر قسم کے قومی جھگڑوں سے الگ ہو کر کام کرے۔ایک اعلیٰ دعوتی مرکز کے ساتھ اگر یہ چیزیں جمع کر دی جائیں تو یقینی ہے کہ اسلام کی وہ نئی تاریخ دوبارہ بننا شروع ہو جائے گی جس کا ہم مدت سے انتظار کر رہے ہیں مگر وہ ابھی تک ظہور میں نہ آ سکی۔[5]

---

[5] یہ مقالہ (عربی زبان میں) الجامعۃ الاسلامیہ (مدینہ منورہ) کے القاعۃ الکبریٰ میں 2 مارچ 1984ء کو پڑھ کر سنایا گیا۔

حرفِ آخر

ابدی صداقت

يُرِيدُونَ اَنْ يُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ (9:32)

وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں حالاں کہ اللہ اپنی روشنی کو کمال تک پہنچائے بغیر ماننے والا نہیں۔

ابدی صداقت

حضرت موسیٰ 15 ویں صدی قبل مسیح میں مصر میں پیدا ہوئے۔ان کو خدا نے اپنا پیغمبر مقرر کیا۔اس وقت مصر میں ایک مشرک خاندان کی حکومت تھی جو اپنے آپ کو فراعنہ کہتے تھے۔حضرت موسیٰ کا سابقہ اس خاندان کے دو بادشاہوں سے پیش آیا۔ایک وہ جس کو خدا نے بچپن میں آپ کی پرورش کا ذریعہ بنایا۔دوسرا وہ جس سے آپ کا مقابلہ پیش آیا۔

حضرت موسیٰ نے جب فرعون مصر کے سامنے حق کا پیغام پیش کیا تو وہ آپ کا مخالف ہو گیا۔حضرت موسیٰ نے عصا کے سانپ بن جانے کا معجزہ دکھایا تو اس نے کہا کہ یہ جادو ہے اور ایسا جادو ہم بھی دکھا سکتے ہیں۔فرعون نے حکم دیا کہ اگلے قومی میلہ کے موقع پر مصر کے تمام جادوگروں کو اکٹھا کیا جائے۔وہ اپنے جادو کے کمالات دکھا کر موسیٰ کے معجزے کو باطل ثابت کریں۔چنانچہ مقرر وقت پر ملک کے تمام جادوگر اکٹھا ہو گئے۔حضرت موسیٰ جب میدان میں آئے تو اس وقت انہوں نے ایک تقریر کی۔اس تقریر کا ایک حصّہ یہ تھا:

> قَالَ مُوْسٰی مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ (10:81-82)۔ موسیٰ نے جادوگروں سے کہا کہ جو کچھ تم لائے ہو وہ جادو ہے۔اللہ اس کو یقیناً باطل کر دے گا۔بیشک اللہ مفسدین کے کام بننے نہیں دیتا۔اور اللہ اپنے کلمات سے حق کو حق ثابت کر دیتا ہے، اگرچہ مجرم لوگوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔

حضرت موسیٰ نے اس وقت جو کچھ کہا وہ دراصل پیغمبر کی زبان سے خدا کے ابدی فیصلہ کا اعلان تھا۔موجودہ دنیا میں امتحان کی آزادی ہے۔اس لیے یہاں ہر باطل کو

ابھرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ مگر یہ ابھار ہمیشہ وقتی اور عارضی ہوتا ہے دنیا کا نظام اتنا کامل اور معیاری ہے کہ وہ زیادہ دیر تک باطل کو قبول نہیں کرتا۔ وہ ہر خلافِ حق بات کو ایک عرصہ کے بعد رد کر دیتا ہے۔ اور بالآخر جو چیز باقی رہتی ہے وہ وہی ہوتی ہے جو حق ہے۔

خدا کے اس قانون کا ظہور پچھلے زمانے میں بھی ہوا اور موجودہ زمانے میں بھی ہو رہا ہے۔ حضرت موسیٰ کے زمانے میں معجزہ کے ذریعہ جادوگروں کے جادو کو باطل ثابت کیا گیا تھا۔ پچھلے زمانوں میں یہ واقعہ بار بار ایک یا دوسری شکل میں پیش آتا رہا ہے۔ موجودہ زمانے میں خود علم انسانی کے ذریعہ خدا نے اس مقصد کو حاصل کیا ہے۔ نزولِ قرآن کے بعد کے دور میں اس سلسلہ میں جو کچھ ہونے والا تھا اس کا ذکر قرآن کی مندرجہ ذیل آیت میں ہے:

سَنُرِيۡهِمۡ اٰيٰتِنَا فِى الۡاٰفَاقِ وَفِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمۡ اَنَّهُ الۡحَـقُّ‌ؕ اَوَلَمۡ يَكۡفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدٌ (41:53)۔ ہم عنقریب ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے، آفاق میں بھی اور انفس میں بھی، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ (قرآن) حق ہے۔ کیا تمھارے رب کی یہ بات کافی نہیں کہ وہ ہر چیز کا شاہد ہے۔

مفسر ابن کثیر نے اس آیت کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے:

سَنُظْهِرُ لَهُمْ دَلَالَاتِنَا وَحُجَجَنَا عَلَى كَوْنِ الْقُرْآنِ حقا منزلا من عند اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ صلى الله عليه وسلم بِدَلَائِلَ خَارِجِيَّةٍ (تفسیر ابن کثیر، جلد 7، صفحہ 187)۔ عنقریب ہم قرآن کے حق اور اللہ کی طرف سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ ہونے کو خارجی دلائل

اور براہین کے ذریعہ ان کے لیے ظاہر کر دیں گے۔

قرآن کی مذکورہ آیت کو ابدی پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ یہ گویا ایک ایسی ہستی بول رہی ہے جس کے سامنے وقت کے انسان بھی ہیں اور مستقبل میں پیدا ہونے والے انسان بھی — یہ آیت وقت کے مخاطبین کے ساتھ اگلی نسلوں کو سمیٹتی ہوئی کہہ رہی ہے کہ آج جو بات علم وحی کی بنیاد پر کہی جارہی ہے، وہ آئندہ خود علمِ انسانی کے زور پر صحیح ثابت ہوگی۔ جو چیز آج خبر ہے وہ کل واقعہ بن جائے گی۔

قرآن کی یہ پیشگی خبر بعد کے دور میں نہایت کامل طور پر صحیح ثابت ہوئی ہے۔ قدیم زمانے میں جادو گروں نے حق کے مقابلے میں جادو کو کھڑا کیا تو خدا نے اس کو ڈھادیا۔ موجودہ زمانے میں علم کے زور پر الحاد وانکار کا دعویٰ کھڑا کیا تو اس کو بھی خدا نے ہباءً منثوراً بنا دیا۔ اسی طرح جس نے بھی کوئی چیز حق کے خلاف کھڑی کی وہ ہمیشہ ڈھادی گئی۔ قدیم زمانے سے لیکر حال کے دور تک کبھی اس میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ خدا کا کلام اپنی صداقت کو مسلسل بلاانقطاع باقی رکھے ہوئے ہے۔

عظمتِ قرآن

قرآن اپنی ذات میں اِس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا کی کتاب ہے۔ قرآن اُسی ابتدائی صورت میں کامل طور پر محفوظ ہے، جیسا کہ وہ ساتویں صدی عیسوی میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا تھا۔ ان خصوصیات نے قرآن کے پیغام کو اتنا زیادہ طاقت ور بنا دیا ہے کہ جب بھی وہ دنیا کے سامنے اپنی اصل شکل میں لایا جائے گا، وہ اقوام عالم کے دلوں کو مسخر کرلے گا۔

PDF

Buy

ISBN 978-81-789888-39-9

9 788178 988399

Goodword Books
CPS International